
بسم الله الرحمن الرحيم

ایک جانباز، تین کہانیاں

تألیف: محمد رضا بایرامی

ترجمہ: سید ظہیر عباس جعفری

نشر شاہد

نام کتاب: ایک جانباز، تین کہانیاں

مولف: محمد رضا بایرامی

مترجم: سید ظہیر عباس جعفری

طبع اول: ۲۰۱۳

ناشر: نشر شاہد، تہران

پہلی کہانی

سب کہتے ہیں میں ٹارچر کرتا رہا ہوں لیکن میں نے فقط اپنا فرض نبھایا ہے اور یہ سبھی کرتے ہیں۔ ملک کا کام تو آخر چلنا ہی تھا، میری حیثیت تو شطرنج کے مہرہ کی بھی نہیں تھی جس کی کوئی اہمیت ہو۔ اگر میں ایک اہم آدمی ہوتا تو آج میرا حال یہ نہ ہوتا۔ میں بھی اگر چاہتا تو بچ جاتا اور آج مرنے سے پہلے سو بار نہ مرتا لیکن شاید تقدیر میں کچھ اور ہی لکھا تھا۔ سچ ہے ہر ایک کو اپنے کئے کی سزا ملتی ہے۔ کل صبح ممکن ہے مجھے ایک دیوار کے پاس لاکر میرے سامنے کچھ پرجوش انقلابی جوان قطار بنائیں اور پھر ایک کے حکم پر سب بندوقیں سیدھی کرلیں اور جب مجھے ان کے بندوق کاک کرنے کی آواز سنائی دے تو سانس سینے میں اٹک جائے اور پیر کانپنے لگیں! لیکن میرا دل چاہتا ہے کہ میری آنکھوں پر پٹی نہ ہو۔ جن آنکھوں نے کبھی حقیقت نہیں دیکھی وہ اپنے کئے کا انجام تو دیکھیں۔ مجھ پر انقلابی جوان گولیاں نہیں برسائیں گے بلکہ یہ میرے اپنے اعمال ہیں جن کی وجہ سے ان کی بندوقوں کا رخ میری طرف ہو گا۔ میں خود اپنا قاتل ہوں گا کوئی اور نہیں۔ کاش! اس وقت مجھ پر اضطرابی کیفیت نہ طاری ہو، کاش! میں اپنے انجام کا خندہ پیشانی سے استقبال کر سکوں۔

زیادہ دیر نہ لگے، بندوق کے دہانہ سے تڑتڑاتی گولیاں نکلیں اور چشم زدن کے ہزارویں حصہ میں انسانی گوشت اور ہڈیاں چیرتی ہوئی نکل جائیں۔اس کے بعد سب ختم ہو جائے گا، ختم؟ اگر ختم نہ ہوا تو؟ اگر یہ احتساب کا آغاز ہوا تو؟ مجھے اس کے بعد کے حساب سے ڈرنا چاہئے ؟ کیا جواب دوں گا؟ میں اگر خائن ہوں تو میری خیانت یہی ہے کہ میں جو کر رہا تھا وہ مجبوری میں کر رہا تھا رضا ورغبت سے نہیں، اگر ایسا ہوتا تو آج کی رات مرنے سے پہلے سو بار نہ مرتا۔ میں کیا کہتا جا رہا ہوں ایسے کام سے کیا رغبت ہو بھی سکتی ہے؟ کاش مجھ میں تھوڑا بہت ایمان ہوتا! میں تو ایک فرمابردار سپاہی تھا، مجھ سے کہا جاتا تھا 'راز اگلواؤ! زبان کھلواؤ'! تو میں سوچتا تھا کہ مجھے ہر قیمت پر مجرم کی زبان کھلوانی ہے، سوچتا تھا موت فقط دوسروں کو آتی ہے، مجھے اگر آئے گی بھی تو برسوں بعد۔ مجھے اعتراف ہے کہ ہم دھر دبوچ لئے گئے ہیں، جب تک حکومت گر نہیں گئی تب تک تو یقین ہی نہیں آ رہا تھا، اس سے پہلے کیا ایسا شور ہنگامہ نہیں ہوتا تھا؟ سولہ جنوری تک ہم یہی سوچتے رہے کہ یہ بھی پہلے کی طرح کی وقتی گھٹا ہے جو جلد چھٹ جائے گی لیکن پانچ جون، ۱۹۶۳ کو تو ایسا لگ رہا تھا کہ

بہت بڑا اسیلاب آگیا ہے جو سب کچھ بہالے جائے گا لیکن قابو پالیا گیا تھا۔ کچھ اگر چہ اس کے بعد بھی دستبر دار نہیں ہوئے، حسین کے والدین بھی انہیں میں سے تھے۔ جب آیت اللہ خمینی کو جلاوطن کیا گیا تو اس کی ماں اس حد تک جری ہو گئی کہ اس نے شہنشاہ کے پاس ٹیلی گراف بھیجا اور اس میں لکھا کہ اگر تم مسلمان ہو تو تم نے ہمارے مرجع تقلید کو کیوں جلاوطن کیا ہے اور مسلمان نہیں ہو تب بھی بتادو تاکہ ہمیں پتہ چلے کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔

۱۹۷۲ میں جب آیت اللہ علم الہدیٰ کا انتقال ہوا تو ہم لوگ سوچنے لگے کہ سب ختم ہو گیا ہے، اب اطمئنان کی سانس نصیب ہو گی۔ اس دن تشیع جنازہ میں اتنی بھیڑ تھی کہ ہم لوگ انگشت بدنداں رہ گئے، نادری روڈ پر تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی، جیسے پورا اہواز شہر امڈ آیا ہو۔ ہم لوگوں نے دکانداروں کو بہت روکنا چاہا کہ دکانیں بند نہ کریں لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا، کوئی ہماری بات پر کان نہیں دھر رہا تھا، ہم اگر زور زبردستی کرتے یا ڈرانے دھمکانے کی کوشش کرتے تو بے کار میں خوار و ذلیل ہوتے۔ اگر طاقت کا استعمال کرتے تب بھی ہوتا کچھ نہ اور بعد میں یہ افواہ بھی اڑتی کی سلامتی

ایجنسیوں نے آیت اللہ کے جنازہ کی تشیع کا عظیم الشان جلوس روکنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہیں، اس لئے ہم نے زیادہ رکاوٹ نہ ڈالی اور بھیڑ کو روڈ کے آخر تک جنازہ لے جانے دیا۔ اس دن ہمارے اہلکارے سادہ کپڑوں میں جگہ جگہ کھڑے تھے اور کوشش کر رہے تھے کہ کوئی اور نعرہ نہ لگنے پائے۔ چونکہ مجمع اتنا زیادہ تھا کہ اگر کچھ ہو جاتا تو بات ہمارے کنٹرول سے باہر ہو جاتی، خیریت ہوئی کہ کچھ نہیں ہوا۔ اس دن ایجنسی (ساواک) کے بڑے افسروں نے اطمئنان کی سانس لی کہ آیت اللہ کی موت کے بعد اب خوزستان میں سکون ہو جائے گا۔ یہ کسی نے سوچا ہی نہیں کہ ان کا جواں سال بیٹا باپ کی جگہ لے کر ایسی آگ بھڑکائے گا جس کی لپکیں بہتوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیں گی۔ اگر مجھے پتہ ہوتا کہ مستقبل میں ایسا ہو گا تو اسے ٹارچر کے دوران ہی قتل کر دیتا، کون میرا کیا بگاڑ لیتا! لیکن ایسا کہاں ہوتا ہے؟ اگر میں ایسا کرتا، ایسے مجرم کو ایذائیں دے دے کے مارڈالتا جس سے کچھ راز مل سکتے تھے تو مجھے اس جرم میں کسی دور افتادہ علاقہ کی طرف بھگا دیا جاتا یا میری ڈیوٹی بدل جاتی۔ اس طرح میرا مقدر بھی بدل جاتا اور پھر 'معبر' کا نام ہر ایک کی زبان پر

نہ ہوتا اور اس کے ہاتھوں ٹارچر ہونے والوں کی تعداد اتنی زیادہ نہ ہوتی کہ گننا مشکل ہو جائے، بہت سوں کو میں جانتا تک نہیں تھا اور نہ یہ پتہ تھا کون کس سنہ میں کس جرم میں گرفتار ہوا تھا۔ ایک ایک کر کے آگے آتے اور جج صاحب سے بتاتے کہ میں نے ان پر کیا کیا ستم ڈھائے ہیں۔ ایک نے اپنا ایک بے حس و حرکت ہاتھ تھام رکھا تھا اور کہنے لگا کہ اس کا ہاتھ میں نے توڑا اور پھر اتنے عرصہ تک ایسے ہی رہنے دیا کہ شل ہو گیا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کا وہ ہاتھ دوسرے سے چھوٹا ہو، چھوٹا اور کمزور! جیسے پچیس سال کے جوان کا نہیں بلکہ کسی بچہ کا ہاتھ ہو۔

اس کے بعد ایک اور شخص کمرۂ عدالت میں داخل ہوا، بہت جلدی میں تھا، جیسے کوئی کام ادھورا چھوڑ کر آیا ہو۔ اس کے چھوٹے قد کے باعث میں اسے پہچان گیا، ہاں! وہی تھا۔۔۔ حسین علم الہدیٰ۔ اسے میں کبھی نہیں بھول سکتا تھا۔ ہم کئی بار آمنے سامنے ہوئے تھے۔ تنہائی میں، میں جب اپنے انجام کا سوچتا اور قدموں سے جیل کی لمبائی چوڑائی ناپتا ہوں تو وہ یاد آتا ہے۔

اتنا قوت ارادی کا مالک قیدی میں نے کبھی زندگی میں نہیں دیکھا تھا، بہت طاقت تھی اس میں۔ ہم نے اسے کئی بار گرفتار کیا، سخت ایذائیں دیں لیکن وہ جیت گیا اور اس کی زبان سے ایک لفظ تک سننے کی ہماری حسرت پوری نہ ہو سکی۔ حسین وہ پہلا شخص ہے جس سے میں ہارا۔ اس سے پہلے جو قیدی زبان نہیں کھولتا تھا اسے میرے نام سے ڈرایا جاتا تھا کہ 'بہتر ہے سب کچھ بتا دو، اپنے آپ کو زیادہ تکلیف نہ دو نہیں تو تم ہو گے اور معبر'۔

میرا نام سن کر ہر کوئی ڈر جاتا تھا، جانتے تھے کہ میں کوئی کام ادھورا نہیں چھوڑتا۔ میں نہ غصہ ہوتا تھا اور نہ جلدی کرتا تھا، قیدی کو کچھ گھنٹے تفتیش والے کمرہ میں سوچنے کے لئے اکیلا چھوڑ دیتا تھا۔ کچھ کے ٹوٹنے کے لئے تو وہی لمحات کافی ہوتے تھے۔ قیدی اس کم روشنی والے کمرہ میں ایک لوہے کی کرسی پر بیٹھ کر انتظار کرتے کہ معبر آکر ان کی خبر لے لیکن معبّر گویا مصروف ہوتا اور اتنی جلدی اپنے شکار پر نہیں ٹوٹ سکتا تھا۔ اس دوران ایسی آڈیو کسیٹیں چلائی جاتیں کہ کوئی تڑپ تڑپ کر فریاد کر رہا اور چلا رہا ہے جبکہ دوسرا گالیاں بک رہا اور کوڑے اور لات گھونسے مار رہا ہے، پھر ایک آواز آتی کہ 'بے ہوش

ہو گیاہے' اور کچھ لمحوں کے لئے خاموشی چھاجاتی۔اس کے بعد قیدی کو ہوش میں لایا جاتا اور فریادوں کا سلسلہ پھر سے شروع ہو جاتا۔ آخر کار وہ التماس کرتا کہ خدا کے لئے مجھے چھوڑ دو۔۔۔ خدا کے لئے نہ مارو۔۔۔ سب کچھ بتاؤں گا، کچھ نہیں چھپاؤں گا۔ شکار بیچارہ سوچتا کہ یہی تھوڑی دیر میں اس کے ساتھ بھی ہونے والا ہے لہٰذا حواس کھو بیٹھتا، سوچتا جو ہونا ہے جلدی ہو جائے، اس میں انتظار کی طاقت نہ رہ جاتی، اعصاب جواب دے جاتے اور پھر ایک جگہ نہ بیٹھ پاتا۔ اٹھتا، کمرہ میں چکر لگاتا، ہر فریاد پر دم بخود رہ جاتا، غور سے سننے کی کوشش کرتا، سر ہاتھوں سے دبالیتا، دروازہ کے پاس آکر باہر دیکھنے کی کوشش کرتا لیکن ناکام رہتا۔ کبھی چھت دیکھتا اور کبھی کمرہ کے کونے! گویا کسی چھوٹے موٹے راستہ کی تلاش میں ہوتا جہاں سے گذر کر اپنا کام تمام کر لے، کبھی ایک طرف پڑی میز کی طرف جاتا کہ گلا گھونٹنے کے لئے کچھ مل جائے مگر کہاں! کمرہ کی بجلی تک کاٹ دی جاتی تھی اور بیلٹ وغیرہ پہلے ہی اتروالی جاتی تھی۔

میں عام طور پر شکار کے اوسان پوری طرح خطا ہونے کا انتظار کرتا تھا۔ کچھ بہت جلدی ہار مان جاتے اور باہر سے مقفل دروازہ پیٹ پیٹ کر سنتری کو

آوازیں دینے لگتے تھا۔ سنتری عام طور پر بولتا ہی نہیں تھا۔ اگر کوئی زیادہ شور مچاتا تو دروازہ کے پاس آکر کرخت لہجہ میں کہتا:

'کیا آفت ہے'؟

'مجھے کیوں یہاں لائے ہو؟ کیا کرنا چاہتے ہو؟ جلدی کرو'۔

'جلدی نہ کرو، تمہاری باری بھی آنے والی ہے'۔

بعض دفعہ اتنے ہی سے میرا کام بہت ہلکا ہو جاتا تھا۔ جب میں ان کے پاس جاتا تو بس سگریٹ جلا کر آرام سے کرسی پر بیٹھ جاتا اور ان کی باتیں سننے لگتا۔ کچھ خوش آمد کے لئے جتنا ہم پوچھتے اس سے کہیں زیادہ بتاتے تھے۔ اپنی جان بچانے کے لئے جس جس کو جانتے تھے اس کا نام لے لیتے تھے کہ وہ بھی ہمارے ساتھ شامل ہے اور بہت سے ہمارے وفادار سپاہی بھی بن جاتے تھے۔ لیکن کیا تھا یہ شخص جس نے مجھے ہرا دیا، ابھی پوری طرح جوان بھی نہیں ہوا تھا، لڑکا سا تھا۔ کوئی دیکھ کہہ نہیں سکتا تھا کہ یہ بھی کوئی اہمیت رکھتا ہے۔ میں نے سوچا دو طمانچے رسید کروں گا تو رونے اور اپنی اماں کو پکارنے

لگے گا۔ جب میں نے اپنے آفیسر سے کہا کہ 'مصری سرکس میں آگ لگانے والے کا پتہ چل گیا ہے' تو اس نے سوچا کہ کوئی لمبا تڑنگا کمانڈو ہو گا لہٰذا کہنے لگا 'اپنے کچھ بہادر سپاہی لے کر جاؤ اور اسے زندہ گرفتار کرنے کی کوشش کرو'۔

شام کو جب اس نے حسین کو دیکھا تو حیران رہ گیا، کہنے لگا 'واقعاً یہی ہے جسے ہم دو سال سے تلاش کر رہے ہیں؟ غلط آدمی تو نہیں پکڑ لائے ہو'؟

اس دن ۱۹۷۲ء کے محرم کی پندرہ تاریخ تھی۔ حسین روز عاشور گرفتار ہوا تھا۔ ہمارا محرم ہمیشہ ہی سخت اور مصروف گذرتا تھا۔ کئی دن پہلے سے چھٹیاں منسوخ کر دی جاتی تھیں، خفیہ اور انتہائی خفیہ خطوں کا سلسلہ چل نکلتا تھا اس لئے کہ کوئی بھی ۱۹۶۳ کی پانچ جون دہرانا نہیں چاہتا تھا۔ اس سال عاشور ہی کے دن ہمیں سخت پریشانی اٹھانا پڑی تھی۔ بہرحال خفیہ خطوط میں کچھ خطرناک مراکز کا ذکر تھا جو پریشانی کھڑی کر سکتے تھے لہٰذا وہاں چوکسی برتنے کی ضرورت تھی۔ لشکر آباد، حجازی اور حصیر آباد نامی محلوں کی جملہ مساجد

مذکورہ بلیک لسٹ میں شامل تھیں اور مسجد علم الہدیٰ تو ہمیشہ ہی سر فہرست رہتی تھی۔اس کے علاوہ مدرسہ ٔبروجردی میں تشکیل پانے والی' دانشوران' نامی اسلامی تنظیم کا نام بھی تھا جس نے بعد میں ہمارے لئے مشکلیں کھڑی کیں۔اس تنظیم کے پروگراموں میں عام طور پر مشکوک افراد ہی تقریریں کرتے تھے۔ یہ لوگ قم سے آتے تھے اور صرف محرم ہی میں نہیں بلکہ ہر جمعہ کو ریل گاڑی سے پہنچ جاتے اوراپنا کام کر کے چلے جاتے تھے۔ان کے اہواز پہنچنے پر ہم ان کے پیچھے لگ جاتے تھے لیکن گرفتار کرنے کا حکم نہیں تھا۔ محرم آتا تو مجالس میں بھی شرکت کرنا پڑتی!ہر مسجد میں کچھ افراد تعینات کر دیے جاتے۔ ان کا کام یہ ہوتا تھا کہ صبح کو جو کچھ اس مسجد میں ہوا ہے اس کی ہیڈ کوارٹر کو رپورٹ دیں۔کچھ جگہوں پر ہم نے جاسوس رکھ رکھے تھے، ان کی وجہ سے ہمارا کام آسان ہو گیا تھا۔کچھ دن ایسے ہی گذرتے تو پھر جلوسہائے عزا کا سلسلہ شروع ہو جاتا اور ہمیں بھی ان میں شرکت کرنا پڑتی، بعض دفعہ اپنے کو خفیہ رکھنے کے لئے کالے کپڑے بھی پہن لیتے تھے۔ایک سپاہی تو دستہ کے ساتھ شامل ہو جاتا تھا لیکن وہ آخر میں پورا ہی ان کے ساتھ

شامل ہو گیا، اس کی ساری رپورٹیں ایک ہی طرح کی اور کسی کام کی نہیں ہوتی تھیں۔ پتہ چلا کہ ایک ہی رپورٹ بدل بدل کر پیش کر رہا ہے۔ وہ شاید یہ بھول گیا کہ وہ ڈیوٹی پر ہے عزادار نہیں۔

اس دن ہمارے سپاہی صبح تڑکے بارکوں سے نکل آئے تھے۔ میں نے خود کئی بار شہر کے اصلی چوک کو جانے والے راستے چیک کئے، لگ نہیں رہا تھا کہ کچھ خاص ہونے والا ہے۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا، لوگ کالے کپڑوں میں مساجد اور امامبارگاہوں کی طرف جا رہے تھے۔ ابھی جلوس شروع نہیں ہوا تھا۔ نادری اور پہلوی روڈ کا میں نے گاڑی سے چکر لگایا۔ میجر سے پوچھا 'کوئی خاص خبر'؟ جواب ملا 'کچھ نہیں'۔

میں نے ناشتہ نہیں کیا تھا لہٰذا یعقوب کو گاڑی سے بھیجا کہ کچھ کھانے کے لئے لے آئے۔ واپس آکر کہنے لگا کہ سینڈوچ کی ساری دکانیں بند ہیں صرف تبرک کا حلیم اور حلوہ مل سکتا ہے۔ میں نے کہا 'نہیں چاہئے' اور بھوکے پیٹ

دوسری سگریٹ جلالی۔ کہنے لگا اگر میں کہوں تو وہ دفتر سے جا کر کچھ لا سکتا ہے۔ میں نے کہا' رہنے دو'۔

گاڑی میں بیٹھا اور ڈرائیور کو نہر کارون کے کنارے چلنے کے لئے کہا۔ وہاں پہنچا تو دیکھا سناٹا ہی سناٹا ہے، نہ کوئی کشتی پر بیٹھا ہے، نہ کوئی نہر کی سیر کے لئے آیا ہے اور نہ کوئی چہل قدمی کر رہا ہے۔ عجیب سا ملال محسوس ہو رہا تھا، دل چاہا ایک کشتی پر بیٹھوں اور اسے پوری سرعت کے ساتھ نئے پل کی طرف دوڑادوں۔ سڑک پر اکا دکا ہی کوئی گاڑی نظر آ رہی تھی۔ پورا شہر غم میں ڈوبا تھا۔ خاموشی ایسی کہ جزیرہ کی طرف سے مینڈکوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اتنے میں وائرلیس بجا، اسماعیلی کی آواز تھی۔

کہنے لگا' سر آپ کہاں ہیں'؟

میں نے کہا' کیا کام ہے'؟

کہنے لگا' حصیر آباد کی طرف سے ایک جلوس اوپر کی طرف آ رہا ہے'۔

گھڑی دیکھی۔ ابھی نو نہیں بجے تھے۔ جلوس کا ٹائم نہیں ہوا تھا۔ میں نے کہا ،ضلع پولیس کے سپاہی اپنی جگہ ڈیوٹی پر ہیں'؟

کہنے لگا'جی سر'۔

میں نے کہا'ٹھیک ہے۔ میں کارون کی طرف ہوں، فضول میں وائرلیس پر رابطہ نہ کرو۔ سپاہیوں سے کہو سامنے نہ آئیں'۔

ہم چل دیے۔ سڑکوں پر آہستہ آہستہ بھیڑ جمع ہو رہی تھی۔ ماتمی دستے علم اور دیگر تبرکات کے ساتھ اسٹیچو چوک کی طرف آگے بڑھ رہے تھے۔ نوحہ خوانوں کی آوازیں سینہ زنی اور زنجیر زنی کی آوازوں میں گھل مل سی گئی تھیں۔ چوک پر بھیڑ تھی، آگے جانے کا راستہ نہیں تھا لہٰذا ہمیں کچھ دیر رکنا پڑ گیا۔ دوبارہ وائرلیس بجا، پھر اسماعیلی تھا۔ میں نے پوچھا'کیا ہوا'؟

کہنے لگا'ایک دستہ کچھ الگ لگ رہا ہے'۔

میں نے کہا'کیسے؟ کیا کر رہے ہیں وہ لوگ'؟

کہنے لگا' باقی دستوں کی طرح عزاداری نہیں کر رہے ہیں'۔

میں نے پوچھا' کیا کر رہے ہیں'؟

جواب ملا' قرآن پڑھ رہے ہیں، جہاد وغیرہ کے بارے میں جو آیتیں ہیں وہ پڑھ رہے ہیں'۔

میں نے کہا' تمہیں کیسے معلوم؟ تمہیں کیا عربی آتی ہے'؟

کہنے لگا' آیات کا ترجمہ کر رہے ہیں۔ ایک آیت پڑھتا ہے اور دوسرا اس کا ترجمہ کرتا ہے۔ دونوں ایک طرح کے ہیں، لگتا ہے بھائی ہیں۔ ہر سو دو سو میٹر کے بعد رکتے ہیں پھر ایک کرسی پر بیٹھتا اور آیت پڑھتا ہے اور ہٹ جاتا ہے۔ پھر دوسرا آکر اس کی جگہ بیٹھتا اور ترجمہ کرتا ہے'۔

میں نے پوچھا' کہاں ہیں یہ لوگ'؟

جواب ملا 'پہلوی روڈ سے تیس میٹر والی روڈ کی طرف مڑ گئے ہیں، تعداد تقریباً دو سو ہو گی، سب نے کالے کپڑے پہن رکھے ہیں اور منظم طور پر چل رہے ہیں '۔

میں نے کہا 'تو مسئلہ کیا ہے '؟

کہنے لگا 'عرض کیا ناسر یہ لوگ الگ انداز سے عزاداری کر رہے ہیں، سب کی توجہ ان کی طرف ہے، بہت سے دستے رک کر انہیں دیکھ رہے ہیں، فٹ پاتھ اور چھتیں لوگوں سے بھری ہیں۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے کہ کہیں کوئی پریشانی نہ کھڑی کر دیں، جو آیتیں پڑھ رہے ہیں ان سے لوگ بھڑک سکتے ہیں '۔

ہماری گاڑی ایک بڑے دستہ کے سامنے جا پہنچی تھی۔ ان کے لاؤڈ اسپیکر کی آواز اتنی زیادہ تھی کہ اسماعیلی کی آواز صاف سنائی نہیں پڑ رہی تھی۔ میں چلایا 'رکو! تھوڑا رکو! یہاں آواز صاف نہیں سنائی دے رہی ہے '۔

پھر میں یعقوب پر چلایا کہ یہاں لا کر کیوں پھنسایا ہے۔کہنے لگا 'کیا کروں سر اس وقت ہر جگہ یہی حال ہے'۔ بہر حال کوئی چارہ تو تھا نہیں سڑک کے کنارے رکے رہے۔ جب دستہ گذر گیا تو میں نے پھر سے وائرلیس آن کیا۔

'اسماعیلی میری آواز سن رہے ہو'؟

'جی سر'

'جس دستہ کی تم بات کر رہے تھے کون سا ہے'؟

'ٹھیک سے پتہ نہیں، لگتا ہے مسجد علم الہدیٰ کا ہے'۔

میں چلایا 'تو پھر صبح سے اب تک کیا کر رہے تھے'؟

کہنے لگا 'میری غلطی نہیں ہے سر! ان کے پاس کوئی ایسا بینر نہیں ہے جس پر ان کے دستہ کا نام لکھا ہو'۔

میں نے پوچھا 'دستہ کا سربراہ کون ہے؟ ہم لوگوں نے پہلے سے تمام دستوں کے سربراہوں کا پتہ نہیں لگا رکھا ہے کیا'؟

کہنے لگا 'ان کا نہیں پتہ سر کون لوگ ہیں، نوجوانوں کا دستہ ہے '۔

میں نے تعجب کیا 'نوجوانوں کا دستہ '!

اس کے بعد چلایا 'تم نے چند لونڈوں کی خاطر میرا وقت برباد کیا ہے؟ انہیں خوش ہو لینے دو کہ عزاداری کر رہے ہیں '۔

کہنے لگا 'انہیں کم نہیں سمجھنا چاہئے، مجھے ان کے ارادے خطرناک لگ رہے ہیں '۔

اس کے آواز اس کی اندر کی پریشانی کی گواہ تھی۔ میں نے کہا 'ٹھیک ہے، حالات پر نظر رکھو! میں خود آ کے دیکھتا ہوں کہ کون لوگ ہیں کہاں کے ہیں '۔

کہنے لگا 'تھانہ کی طرف جا رہے ہیں '۔

میں نے یعقوب سے کہا 'سن تو لیا تم نے! چلو تھانہ '۔

یعقوب نے گاڑی تیس میٹر والی روڈ کی طرف موڑ لی۔ ہم تیز نہیں چل سکتے تھے، آگے چل کر تو راستہ بند ہی ہو گیا اور ہمیں مجبوراً رکنا پڑا۔ دستوں کا سلسلہ تھا کہ ختم ہی نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے وائرلیس شرٹ کے اندر چھپایا اور گاڑی سے اتر آیا۔ لگ تو نہیں رہا تھا کہ کوئی پریشانی کھڑی ہوئی ہو لیکن میرا خود جا کر حالات کا جائزہ لینا ضروری تھا۔ اس لئے کہ اگر کچھ ہو جاتا تو 'زندوکیلی' کو کیا جواب دیتا۔ ایسے ہی اس کا رویہ ایسا ہوتا ہے کہ جیسے ہم نے اس کے باپ کا ترکہ چھین لیا ہو۔

'مجھے مفت خور آدمی نہیں چاہئے، ایسے لوگوں کے لئے یہاں جگہ نہیں ہے۔ اگر کسی کو کچھ کرنا نہیں آتا تو یہاں سے چلا جائے ورنہ میں کسی کی سستی یا کاہلی برداشت کرنے والا نہیں ہوں'۔

یعقوب نے کہا 'میں کیا کروں سر! آپ کے ساتھ آؤں یا گاڑی میں بیٹھا رہوں'؟

'میرے ساتھ آؤ'۔

ہم نے گاڑی کو تالا لگایا اور تھانہ کی طرف چل دیے۔ گیٹ پر کچھ سنتری کھڑے تھے، ایک سے میں نے پوچھا 'میجر صاحب کہاں ہیں آفیسر'؟

جواب ملا 'کسی کا فون آیا تھا بات کرنے اندر گئے ہیں'۔

'انہیں جلدی باہر بلاؤ'۔

جب میجر آیا تو میں نے اس سے کہا 'یہ کیا ہو رہا ہے میجر صاحب؟ یہ کون سا نوجوانوں کا دستہ ہے جس کی بات ہو رہی ہے'؟

کہنے لگا 'کیا بتاؤں سر! ابھی کچھ دیر پہلے یہاں سے گذرے ہیں اور اب چوبیس میٹر والی روڈ کی طرف چلے گئے ہیں۔ یہاں بھی کچھ دیر رکے تھے۔ شاید کسی نے انہیں بھڑکا رکھا ہے، ان کا سربراہ ایک ناٹا سا لڑکا ہے۔ جب یہ لوگ یہاں پہنچے تو وہ کرسی پر بیٹھا اور چلا کر مائک پر کہنے لگا کہ 'اے لوگو! اگر تمہارے پاس دین نہیں تو کم سے کم آزاد تو رہو'۔ اور ایسے مجھے دیکھ رہا تھا کہ جیسے اس کا مخاطب میں ہی ہوں'۔ میں نے کہا کہ 'اور تم نے بھی کچھ نہیں کیا'؟

کہنے لگا' میں کیا کر سکتا تھا؟ مجھے ان کے سلسلہ میں کسی طرح کا کوئی آرڈر نہیں ملا ہے۔ ہاں میں نے کچھ سپاہی ان پر نظر رکھنے کے لئے ان کے ساتھ لگا دیے ہیں'۔

میں نے کہا' بس یہی'۔

اس نے خاموشی سے سر جھکا لیا۔ اب مجھے پتہ چلا کہ اسماعیلی بلاوجہ پریشان نہیں ہو رہا تھا۔ اس عجیب و غریب دستہ کا پتہ لگانا چاہئے، کوئی بات ضرور ہے۔ میں نے میجر سے کہا کہ اپنی فورس تیار رکھے تا کہ اگر ضرورت پڑی تو فوراً ان سے کام لیا جاسکے۔ ادھر اطراف میں تعینات اپنے سپاہیوں کو بھی میں نے الرٹ کیا اور چوک کی طرف چل پڑا۔ چوک سے کچھ پہلے ہی اسماعیلی مل گیا، نوجوانوں کا دستہ اس کے آگے تھا۔ اس سے میں نے پوچھا' کیا معاملہ ہے'؟

کہنے لگا' کچھ نہیں سر! بس یہ لوگ چوک پہنچنے ہی والے ہیں، وہاں اعلیٰ حضرت کے مجسمہ کے گرد چکر لگائیں گے اور بس ان کے شر سے چھٹکارا مل جائے گا'۔

'تمہیں پتہ نہیں چلا کہ ان کا سربراہ کون ہے'؟

'نہیں سر! میں نے ایک سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ ان کا سربراہ کوئی نہیں ہے'۔

یعقوب نے خبر دی کہ پولیس کے جوان پہنچ رہے ہیں۔ میں نے پلٹ کر دیکھا بندوقیں ہاتھ میں لئے کچھ سپاہی نزدیک پہنچ چکے تھے اور اب دستہ کے دونوں طرف چل رہے تھے۔ ان کے علاوہ ہمارے اپنے تین سپاہی بھی وہاں تھے۔ اس طرح مجھے، اسماعیلی اور یعقوب کو ملا کر ہماری تعداد چھ تھی۔ یعقوب کو میں نے بھیجا کے پولیس کے آفیسر سے کہے کہ وہ لوگ تیار رہیں تا کہ اگر ضرورت پڑی تو کچھ لوگ پکڑ لئے جائیں۔ خود میجر کا کوئی اتہ پتہ نہیں تھا۔ دستہ چوک کے نزدیک پہنچ چکا تھا۔ ہم انتظار کر رہے تھے کہ وہ لوگ مجسمہ کے گرد چکر لگا لیں تو آگا بڑھا جائے لیکن یکبارگی تعجب سے میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ لڑکے چوک پہنچنے سے پہلے ہی ایک گلی میں مڑ گئے! بات واضح تھی، ان لوگوں نے اعلیٰ حضرت کے مجسمہ کی توہین کرنا چاہی تھی اور وہ بھی اتنے مجمع کے سامنے! جبکہ دستہ کے ساتھ پولیس دیکھ کر سب کی توجہ انہیں لڑکوں پر تھی۔ آج تک کبھی کسی نے ایسی توہین نہیں دیکھی ہو گی۔ ہر دستہ چوک پہنچ کر

اعلیٰ حضرت کے مجسمہ کا طواف کرتا تھا لیکن ان لڑکوں نے وہ بھی ہماری آنکھوں کے سامنے۔۔۔وکیلی کو اگر پتہ چلا تو ہماری زندگی تباہ کر دے گا۔ میں چلایا'فوراً پکڑ لو انہیں، جتنے بھی ہاتھ آتے ہیں'۔

لیکن وہ تیزی سے تتر بتر ہونے کی کوشش میں تھے، مجمع میں شامل ہوتے اور کھو جاتے۔ بہر حال ہم چند ایک کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ ایک وہی جوان تھا جو کرسی کو خیر باد نہ کہہ سکا اور کرسی لئے لئے ہی مجمع میں بھاگا چلا جا رہا تھا کہ ہم نے اسے پکڑ لیا۔ اس کا نام فیض اللہ تھا، اچھا شکار لگ رہا تھا۔ دوسرے دو لڑکوں کے نام نادر اور عماد تھے جو ہمارے بہت کام آئے خاص طور پر نادر۔ چوتھے لڑکے کا نام محسن تھا، وہ بھی فیض اللہ کی طرح صاف صاف سب کچھ بتا رہا تھا لیکن اس کے پاس زیادہ معلومات تھیں نہیں۔ اسماعیلی اور یعقوب کا دل مکدر تھا کہ ہم زیادہ لوگوں کو کیوں نہیں گرفتار کر سکے لیکن مجھے امید تھی کہ انہیں چند لوگوں کے ذریعہ ہم اور بھی جن کی ضرورت ہے انہیں پکڑ لیں گے۔

گرفتار شدگان کو گاڑی میں بٹھانے سے پہلے میں نے انہیں قطار میں کھڑا کیا اور اسماعیلی سے پوچھا' قرآن پڑھنے والے بھی انہیں میں ہیں'؟

اسماعیلی نے کہا' نہیں سر'۔

یعقوب بولا' افسوس کہ ہمارے ہاتھ سے نکل گئے'۔

میں نے کہا' کوئی بات نہیں جیسے بھی ہوا انہیں ڈھونڈھ لیں گے'۔

ہم قیدیوں کو انٹیروگیشن سینٹر لے کر پہنچے اور فوراً انہیں ایک دوسرے سے الگ کر دیا۔ اگر مجھے پتہ ہوتا کہ نادر اور عماد راز اگلیں گے تو بلاوجہ فیض اللہ کے ساتھ وقت برباد نہ کرتا۔ لیکن چونکہ وہ بقیہ سے بڑا تھا اور لگ رہا تھا کہ اس کے پاس زیادہ معلومات ہوں گی لہٰذا میں نے شروعات اسی سے کی لیکن وہ آخر تک ٹال مٹول کرتا رہا اور ٹھیک سے کوئی جواب نہیں دے پایا۔ جب میں پوچھتا تھا کہ یہ سب کس نے کروایا ہے؟ تو جواب ملتا کہ کسی خاص آدمی نے نہیں بلکہ ایک دم سے ہم نے ارادہ کیا کہ گلی میں مڑ لیتے ہیں۔ میں پوچھتا کہ اس سے پہلے وہ سب کیا کر رہے تھے؟ قرآن پڑھ پڑھ کر لوگوں کو بھڑکا رہے

تھے؟ عاشور کے دن نوحہ خوانی ہوتی ہے یا تلاوت قرآن؟ کہتا تھا 'کیا فرق پڑتا ہے، کوئی ضروری ہے کہ سب ایک ہی طرح عزاداری کریں، یہ ہمارا عزاداری کا طریقہ تھا جو ہمیں نہیں لگتا کہ کوئی جرم تھا'۔ اس کی زبان کھلوانے کے لئے میں نے لات گھونسے شروع کر دیے لیکن جب دیکھا کہ کوئی فائدہ نہیں ہے تو میں نے اسے تخت سے باندھنے کا حکم دیا اور ہنٹر منگوایا سوچا ہنٹر پڑیں گے تو سب کچھ اگل دے گا لیکن تب بھی کوئی فائدہ نہ ہوا۔ اب مجھے اس سے مایوسی ہوتی جا رہی تھی، شاید اسے زیادہ کچھ پتہ نہیں تھا۔ تبھی یعقوب کمرہ میں داخل ہوا اور کہنے لگا 'باقی تینوں کی ابتدائی تفتیش ہو گئی ہے'۔

میں نے پوچھا 'کوئی خاص بات پتہ چلی ان سے'؟

آنکھ دبا کر کہنے لگا 'جی سر سب کچھ بتا دیا ہے'۔

واضح تھا کہ ان سے کوئی کام کی بات نہیں اگلوا پائے ہیں۔ میں نے فیض اللہ کی طرف رخ کر کے کہا' دیکھا؟ تمہارے دوست سب کچھ بتا گئے ہیں۔ تم بلا وجہ اپنا ریکارڈ خراب کر رہے ہو۔ یہاں کوئی گونگا بھی ہو تو وہ بھی بول جاتا ہے تم

کیا چیز ہو۔ میرے خیال میں ابھی بھی دیر نہیں ہوئی ہے، اگرچہ ہمیں سب کچھ پتہ ہے لیکن تم بھی بتادو تا کہ چھٹی مل جائے۔ تم ابھی بچہ ہو، اس کھیل میں مت پڑو، اپنا استحصال مت ہونے دو'۔

کہنے لگا'میرے پاس آپ لوگوں سے بتانے کے لئے کچھ نہیں ہے۔ ہم نے فقط عزاداری کی ہے اور بس! اب آپ لوگوں کو جو کرنا ہے کر لیجئے'۔

میں نے کہا'میں تو صرف تمہاری مدد کرنا چاہتا تھا'۔

یعقوب نے مجھے اشارہ سے باہر بلایا اور دالان میں لے جا کر کہنے لگا'ان لوگوں کی پذیرائی شروع کی جائے، اجازت ہے'؟

میں نے کہا'نہیں! مجھے ڈر ہے کہ تم کوئی غلطی نہ کر بیٹھو، رکو میں خود آتا ہوں۔ بات بگڑنی نہیں چاہئے، اِس کے پاس تو زیادہ معلومات نہیں لگ رہی ہیں۔ اب مجھے فقط انہیں سے امید ہے'۔

بولا' سر وکیلی صاحب کافی دباؤ ڈال رہے ہیں۔ ابھی ان کے دفتر سے فون آیا تھا پوچھ رہے تھے کہ کیا ہوا؟ میں نے کہا تفتیش چل رہی ہے، کہیں ہم ان کے عتاب کا شکار نہ ہو جائیں'۔

میں نے کہا' زندوکیلی کے سامنے میں جوابدہ ہوں، تمہارا اس سے کیا مطلب'؟

کہنے لگا' تو کچھ نہ کریں انہیں ایسے ہی چھوڑ دیں'؟

میں نے کہا' صرف نفسیاتی دباؤ ڈالو، کیسٹ بجاؤ یا جو سمجھ میں آتا ہے کرو، جلد بازی ہر گز نہ کرنا'۔

اس دن جب سورج ڈوبا تو باہر سے شام غریباں کا غم مناتے ماتمی دستوں کی آوازیں آرہی تھیں اور اندر سے ان لڑکوں کے چیخنے چلانے کی جنہیں ہم نے پکڑ رکھا تھا اور اب ان پر ہنٹر پڑ رہے تھے۔ مجھے یاد ہے سردی تھی، ہوا بھی چل رہی تھی۔ میں نے قیدیوں سے راز اگلوانے کے لئے اتنی طاقت لگائی تھی کہ تھکا اور پسینہ میں شرابور تھا۔ سگریٹ پینے کے لئے صحن میں آیا تو ہوا کا ایک جھونکا میری پیشانی کو چھوتا ہوا نکل گیا۔ میں آپے میں آیا اور یاد آیا کہ

کئی دن سے گھر نہیں گیا ہوں جیسے میں انسان تھا ہی نہیں، نہ میری کوئی زندگی تھی نہ گھر۔ جب بھی کوئی کام ہوتا تو میں اسے ختم کئے بنا دم نہیں لیتا تھا البتہ تب بھی کسی کو میری کوئی فکر نہیں تھی۔ انہیں مجھ سے فقط کام چاہئے تھا۔ بہر حال وہ دن بغیر کسی خاص نتیجہ کے ختم ہو گیا۔ اگلے دن میں نادر کے پاس پہنچا، بیچارہ پہلے ہی ہارا ہوا تھا۔ ان لوگوں میں سے تھا کہ جن میں انتظار کی طاقت نہیں ہوتی۔ چوبیس گھنٹے کی حوالات سے اس کا چہرہ مرجھا چکا تھا۔

مجھے یقین تھا کہ یہ اس کی زندگی کی پہلی رات ہے جو اس نے گھر سے باہر گذاری ہے۔ میں نے پوچھا 'تمہیں کیوں گرفتار کیا گیا ہے'؟

کہنے لگا 'آپ ہی لوگوں نے گرفتار کیا ہے، مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہیں'؟

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا کہ کہیں اسے غلطی سے تو نہیں پکڑ لیا ہے۔

'تو میں کہتا ہوں کہ تمہیں مظاہرہ اور شہنشاہ کی توہین کی جرم میں گرفتار کیا گیا ہے اور اب میں تمہارا وہ حال کروں گا کہ جو تم نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا ہوگا'۔

کہنے لگا، مجھے اس سب کا کچھ پتہ نہیں ہے'۔

میں نے کہا، تو کیا پتہ ہے'؟

بولا، کچھ نہیں'۔

ایک لات جو اس کی پسلیوں پر جڑی تو پیچھے کو لڑھک گیا اور سانس رک گئی۔

'ابھی معلوم ہو جائے گا تمہیں کیا کیا پتہ ہے، تم وہاں کیا کر رہے تھے'؟

'دیکھنے آیا تھا'۔

'یعنی تم عزاداروں میں شامل نہیں تھے؟ سب نے تمہیں وہاں دیکھا ہے'۔

اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھے کہ کیا کہے۔ میں نے کہا، سوچ سمجھ کے بولنا! اگر جھوٹ بولا تو جان نہیں چھوٹے گی'۔

لگ رہا تھا اپنے آپ سے الجھا ہوا ہے۔ آخر کار اس نے زبان کھول ہی دی۔

'میں صرف عزاداری میں شرکت کر تا رہا ہوں'۔

'اپناہاتھ لاؤ'۔

اس نے دایاں ہاتھ آگے بڑھایا تو میں نے انگلیاں پکڑ کر زور سے پیچھے موڑ دیں۔ ٹیوڑھا گیااور منہ سے چیخ نکل گئی۔ میں نے کہا' یہ جھوٹ بولنے کے لئے تھا، اب بتاؤ تمہاراسر براہ کون ہے'؟

بولا' نہیں معلوم، میں ان لوگوں کو نہیں جانتا'۔

دروازہ کے پاس جاکر میں نے یعقوب کو آواز دی۔ پھر نادر کو تخت سے باندھا اور یعقوب سے کہا کہ اسے ہنٹر لگائے۔مجھے پتہ تھا کہ اس کی زبان کھلوانے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ ابھی پانچ ہنٹر ہی پڑے ہوں گے کہ چلانے لگا' نہ مارو! خدا کے لئے نہ مارو! سب کچھ بتادوں گا، سب کچھ۔۔۔'۔

اسے کھول دیا اور کہا' ہم تمہارا برا نہیں چاہتے۔ بلاوجہ اپنے کو کیوں تکلیف دے رہے ہو؟ اگر اچھے لڑکے ہو تو ہم تمہاری مدد بھی کر سکتے ہیں۔ ظاہراً تمہاری کوئی غلطی نہیں ہے، تمہیں دھوکہ دیا گیا ہے۔اب بتاؤ تم لوگوں کو کس نے بھیجا تھا'؟

کہنے لگا، نہیں معلوم۔ قسم خدا کی نہیں معلوم'۔

میں نے کہا 'یعقوب۔۔۔'!

کہنے لگا 'یقین کیجئے، میں سچ کہہ رہا ہوں'۔

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا جھوٹ نہیں بول رہا تھا۔

'تو بتاؤ تمہارے دستہ کا سربراہ کون تھا؟ وہی جو کرسی پر بیٹھ کر آیت پڑھتا تھا۔۔۔ اس کا کیا نام تھا'؟

سر جھکا کر کہنے لگا 'علم الہدی۔ حسین علم الہدیٰ'۔

میں نے یعقوب کو دیکھا اس کی آنکھوں میں چمک آگئی تھی۔

'اسے کیسے جانتے ہو'؟

'ان کی مسجد میں ان لوگوں سے آشنائی ہوئی'؟

'پھر'؟

'اور مجھے کچھ پتہ نہیں'۔

'بات نہیں بنی۔ طے پایا کہ تم ہمارے ساتھ تعاون کروگے بھول گئے'۔

پھر میں نے یعقوب سے کہا کہ اسے چھت سے لٹکا دے۔ نادر ہاتھ جوڑنے لگا لیکن ہم نے کچھ نہیں سنا۔ اس پر تھوڑا دباؤ ضروری تھا۔ جب سر پر خون کا دباؤ بڑھا تو کہنے لگا اسے جو پتہ ہے سب بتائے گا۔ اب کہ سچ کہہ رہا تھا اس لئے کہ اس نے عاشور کے اس مظاہرہ کے اصل مجرموں کے علاوہ ایک اور اہم راز فاش کیا تھا۔

'میں حسین کو کئی سال سے جانتا ہوں۔ وہ علم الھدی مسجد کا مکبر ہے۔ اسی نے مصری سرکس کو آگ لگائی تھی، میں اور ایک دو اور لڑکے بھی اس کے ساتھ تھے'۔

میں اور یعقوب نے تعجب سے ایک دوسرے کو دیکھا۔

'سرکس کو کیوں آگ لگائی تھی تم لوگوں نے'؟

'وہاں ہو رہی سرگرمیوں کی وجہ سے۔ عورتیں غیر مناسب کپڑوں میں ظاہر ہوتی اور ناچتی تھیں اس لئے۔ منصوبہ حسین نے بنایا۔ تھا کئی بار وہاں گیا اور اس جگہ کی اچھی طرح چھان بین کرنے کے بعد کہنے لگا کہ ہمیں دوپہر کے وقت یہ کام کرنا ہوگا جب سرکس میں کوئی نہیں ہوتا۔ پہلے ہمیں نہیں پتہ تھا کہ وہاں کیا ہوتا ہے، ہم اپنے کاموں میں لگے رہتے تھے، سرکس وغیرہ نہیں جاتے تھے لیکن جب دیکھا کہ لڑکوں کے جھنڈ کے جھنڈ تماشا دیکھنے جاتے ہیں تب پتہ چلا کہ بات کیا تھی'۔

نادر بولتا جارہا تھا اور شاید اسے خود بھی پتہ نہیں تھا کہ وہ کتنی اہم معلومات ہمارے حوالہ کررہا ہے۔ سرکس میں آگ لگنے کے واقعہ کے بعد ہم نے اپنی پوری طاقت لگادی تھی؛ اطراف کے دکاندروں سے پوچھ تاچھ، مشکوک افراد کا ٹارچر یہاں تک کہ اطراف کے شہروں تک میں ڈھونڈھ ڈالا کہ یہ حرکت کس کی ہے لیکن کوئی سراغ نہیں ملا۔ نہ کسی نے کچھ دیکھا تھا اور نہ کسی کو کچھ پتہ تھا۔ مصری تو اسی دن بوریا بستر باندھ کر رفوچکر ہوگئے اور یہاں ہم تھے اور افسران بالا کی ناراضگیاں! ہماری یہ ناکامی ہماری نااہلی کے ثبوت کے طور پر

فائل بند کر لی گئی تھی۔ آج اس راز سے پردہ ہٹ رہا تھا اور وہ بھی ایسے وقت میں جب ہمیں قطعی اس کی امید نہیں تھی۔ میں اسی دن اپنے ہیڈ کے پاس جا پہنچا۔

'سر ہمیں علم الہدیٰ نامی شخص کو گرفتار کرنا ہے، حسین علم الہدیٰ'۔

'عاشور کے مظاہرہ کے جرم میں'؟

'ہاں'

'یہ آیت اللہ علم الہدیٰ کا کچھ لگتا ہے'؟

'جی اس کا بیٹا ہے'۔

'بہت برا ہوا، پھر سے علم الہدیٰ کا نام لوگوں میں عام ہو جائے گا، تھوڑا سوچنے دو، شاید اسے گرفتار نہ کرنا ہی بہتر ہو'۔

'نہیں ہو سکتا سر! اس نے صرف مظاہرہ ہی نہیں کروایا بلکہ دو سال پہلے مصری سرکس میں آگ بھی اسی نے لگائی تھی، یاد تو ہو گا نہ آپ کو'؟

وہ حیرت سے کرسی سے اٹھا اور کہنے لگا 'کیسے بھول سکتا ہوں اس واقعہ کو جس کی وجہ سے ہیڈ کوارٹر میں ہماری سخت بدنامی ہوئی تھی'۔

میں نے مسکرا کر کہا 'تو پھر گرفتار کرنے کی اجازت دے دیجئے'۔

'ٹھیک ہے جب اسے لے آنا تو میں بھی اسے دیکھنا چاہوں گا'۔

'وہ ہمارے چنگل میں ہے، بس ان سب کی تفتیش پوری ہو جانے دیجئے اس کے بعد آپ کے پاس رپورٹ پیش کرتا ہوں'۔

میں باہر نکلا، ایسا لگ رہا تھا جیسے کندھوں پر بہت بھاری بوجھ تھا جو اتر گیا ہے۔ کیا دو سال پہلے کی کوتاہی کا جبران ہو سکتا ہے؟ اس وقت تک میں نے حسین کو نہیں دیکھا تھا۔ آیت اللہ علم الہدیٰ کے کئی فرزند تھے؛ بڑے بیٹے کا نام مصطفیٰ تھا، بڑا اچھا مقرر تھا۔ بعض دفعہ ہمارے سپاہی اس کی مجلس سنتے اور رپورٹ لاتے تھے۔ ہماری پوری نظر تھی اس پر۔ لیکن حسین کا کچھ پتہ نہیں تھا کون ہے، کتنا بڑا ہے۔ یہ واضح تھا کہ خطرناک آدمی ہے شاید کہیں سے اس نے گوریلا تربیت بھی لے رکھی تھی۔ جو شخص سرکس کو آگ لگا دے اور

کوئی نشان تک نہ چھوڑے ظاہر ہے کوئی ماہر ہی ہو گا لیکن جب مجھے یاد آیا کہ اس دستہ میں سارے نوجوان لڑکے تھے تو سخت تعجب ہوا کہ کیا یہ ایک کم عمر لڑکے کا کام تھا۔ یقین نہیں آرہا تھا۔ تحقیق کرنے پر پتہ چلا کہ حسین سعادت جعفری نامی اسکول میں پڑھتا ہے لہٰذا اسے کلاس سے گرفتار کرنا زیادہ بہتر تھا تاکہ اس کے ممکنہ ساتھیوں کے دل بھی تڑپیں۔

شاید ان میں سے بعض وہی تھے جن سے حسین نے فٹ بال کے بہانہ قربتیں بڑھائیں اور پھر انہیں مسجد لے آیا۔ ہمیں بعد میں پتہ چلا کہ جب اذان کی آواز آتی ہے تو حسین کھیل بند کرکے اپنے ساتھیوں کو مسجد لے آتا ہے۔

اس دن، میں چند مسلح سپاہیوں کو لے کر اسکول چل پڑا۔ لگ تو نہیں رہا تھا کہ ہم جس کے تعاقب میں جارہے ہیں اس کے پاس اسلحہ ہو گا لیکن پھر بھی تمام احتیاطی تدابیر ضروری تھیں۔ ہم اسکول کے پھاٹک پر پہنچ کر رک گئے۔ جب انٹرول ختم ہونے کی گھنٹی بجی تو صحن میں داخل ہوئے۔ صحن اور عمارت کے اطراف کا معائنہ کیا، بھاگنے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ دو سپاہی صحن میں ہی رہے

اور ایک کو لے کر میں اسکول کے دفتر میں گھس گیا۔ جب پرنسپل کی نظر ہم پر پڑی تو اس کی ہوائیاں اڑ گئیں، منہ کھلا کا کھلا رہ گیا، نیم ایستادہ حالت میں بولا:

'فرمایئے'!

'آپ کے یہاں حسین علم الہدی نام کا لڑکا پڑھتا ہے'؟

'جی'

'کس قسم کا لڑکا ہے'؟

'باادب اور مہذب طالب علم ہے'۔

'توخوب پہچانتے ہیں آپ اپنے طلبہ کو'!

'کیوں کیا ہوا'؟

'کیا سکھاتے ہو یہاں اپنے شاگردوں کو، تخریب کاری'؟

پرنسپل کے ہوش اڑ گئے اور زبان پر تالا لگ گیا۔ میں نے پوچھا 'تو کہاں ہے آپ کے اس مہذب طالب علم کا کلاس روم'؟

پرنسپل حسین کا کلاس روم دکھانے کے لئے آگے آگے چل پڑا۔ کلاس کے باہر میں نے ہاتھ کوٹ کے اندر کر لیا اور کوٹ کا سامنے کا بٹن کھول دیا۔ پرنسپل نے دروازہ کھٹکھٹائے بغیر ہی ہمیں اندر کی راہ دکھادی۔ سب گھبرا گئے، میں نے طلبہ پر ایک نظر دوڑائی کہ کون حسین علم الہدیٰ ہو سکتا ہے۔ جرمیات کے کلاس کا مجھے کوئی فائدہ نہ ہوا۔ ہم جس انداز سے داخل ہوئے تھے سب سمجھ سکتے تھے کہ ہم کہاں سے آئے ہیں۔ یقیناً حسین بھی سمجھ گیا ہو گا لہٰذا میں نے اپنی طرف اٹھی تیس چالیس آنکھوں میں ڈراور خوف ڈھونڈھنا چاہا لیکن کچھ نہیں دکھائی دیا۔ کیا وہ نہیں ڈرا تھا؟ ایک لمحہ کے لئے میں نے سوچا کہ شاید وہ آج اسکول آیا ہی نہ ہو۔ ٹیچر سے پوچھا 'کوئی غیر حاضر بھی ہے آج'؟

جواب ملا 'نہیں'۔

میں نے دوبارہ طلبہ پر نظر دوڑائی اور پوچھا، حسین علم الہدیٰ کون ہے؟ کھڑا ہو جائے'۔

ایک دبلا پتلا لڑکا کھڑا ہو گیا اور میری آنکھوں میں دیکھنے لگا۔ میں نے بھی اسے تعجب سے دیکھا۔ وہی تھا حسین علم الہدی؟ اسی نوجوان لڑکے نے مصری سرکس کو آگ لگائی تھی اور عاشور کے دن اس انداز سے مظاہرہ کر رہا تھا؟

،حسین علم الہدیٰ تم ہو'؟

فضول سوال تھا۔ شاید وہ بھی سمجھ گیا کہ مجھے اسے دیکھ کر کس قدر تعجب ہوا ہے۔ پھر یہی حال ہیڈ کا بھی ہوا جب اس نے پہلی بار اسے دیکھا۔

آرام سے ڈیسک سے نکلا جیسے گرفتار ہونے کا انتظار کر رہا ہو۔

'مجھ سے کیا کام ہے'؟

،تمہیں ہمارے ساتھ چلنا ہو گا، باقی تم خود جانتے ہو'؟

ہم نیچے اترے، حسین کو گاڑی کے عقبی نشست پر بٹھایا، اس کے دونوں طرف دو مسلح سپاہی بیٹھے اور ہم اس کے گھر کی طرف چل دیے۔مجھے امید تھی کہ وہاں سے مزید کچھ شواہد ملیں گے۔پہلے دن میں نے اس سے متعلق ساری فائلیں منگوائی تھیں۔اس کے باپ کی تو لمبی چوڑی فائل تھی لیکن خود اس کی فائل میں کوئی خاص چیز نہیں تھی۔بس ایک سپاہی کی رپورٹ تھی کہ ایک بار جب مسلح افواج کی بارہویں ڈویژن کے لئے تاسیس کردہ مسجد کی افتتاحی تقریب میں اسے تلاوت قرآن کے لئے بلایا گیا تو اس نے ایک اعلیٰ فوجی عہدہ دار جعفریان کا احترام نہیں کیا اور اس کی آمد پر کھڑا نہیں ہوا۔اس کے بعد آیتیں بھی وہ پڑھیں جن میں جہاد وغیرہ کی دعوت تھی۔رپورٹ لکھنے والے نے اپنی رائے کے کالم لکھا تھا:

'چونکہ قاری کی عمر کم ہے۔مذکورہ اعلیٰ آفیسر کی آمد پر اس کے طرف سے اس کا احترام نہ بجالانے کی وجہ اس کی کمسنی ہی ہو سکتی ہے۔اس وقت شاید وہ تلاوت کے لئے سورہ تلاش کر رہا تھا لہٰذا اسے یاد ہی نہیں رہا کہ آفیسر کے

احترام میں کھڑا ہونا چاہیے۔ لیکن جہاد سے متعلق آیات کی تلاوت کو شاید اتفاق نہ کہا جاسکے خاص طور پر قاری کے خاندانی ماضی کے تناظر میں'۔

حسین راستہ بھر مطمئن تھا، جیسے کچھ ہوا ہی نہیں یہاں تک کہ جب ہم اس کے گھر کے سامنے پہنچ گئے تب بھی اس نے کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا۔ ہمارے کہنے کا منتظر تھا، جیسے ہم نے کہا اترو تو اتر آیا۔ ایک سپاہی نے دروازہ کھٹکھٹایا، اس کے بھائی کاظم نے دروازہ کھولا۔ میں نے اسے صحن کی طرف دھکا دے کر پوچھا 'تمہارا کمرہ کہاں ہے'؟

گھر والے حیران و پریشان ہمیں دیکھے جارہے تھے۔ سیڑھیاں چڑھ کر ہم اس کے کمرہ میں جا پہنچے، وہ دروازہ کے پاس ہی کھڑا رہا، انتہائی سکون سے! اور ہمیں دیکھتا رہا۔ ہم جوتوں سمیت کمرہ میں داخل ہوئے تھے لہٰذا کہنے لگا 'ہم لوگ اس فرش پر نماز پڑھتے ہیں، آپ لوگ جوتے اتار دیجئے'۔

پتہ نہیں اس کی آواز میں کیا دم تھا کہ میں ایک لمحہ کے لئے بھول گیا تھا کہ میں کون ہوں اور وہاں کیوں آیا ہوں۔ جب اپنے آپ میں آیا تو جوتے اتار چکا تھا۔

ہم نے سارا سامان فرش پر بکھیر دیا، کتابیں ایک ایک کرکے دیکھیں، کاغذ الٹ پلٹ کر دیکھے، کاپیاں کھنگال ڈالیں لیکن کچھ بھی ہاتھ نہ آیا۔ سپاہی ایک ایک کمرہ کی تلاشی لینا چاہتے تھے لیکن میں نے منع کر دیا اس لئے کہ پتہ چل گیا کہ انہوں نے گھر میں کچھ چھپا کر نہیں رکھا ہے۔ حسین کا پر سکون چہرہ اس کا گواہ تھا۔ میں نے اپنے آپ سے کہا 'اتنا چھوٹا ہے کہ اسے خبر تک نہیں کہ کس کے ہتھے چڑھ گیا ہے، بہت جلد اس کا وہ حال کرتا ہوں کہ اپنے خواب تک سنائے گا'۔

ہم باہر نکلے، مطلع ابر آلود تھا اور بارش آمد آمد تھی۔ حسین کو گاڑی پر بٹھایا اور جلدی سے دفتر کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس وقت تک میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ چھوٹا سا بچہ اس افسانہ کو حرف غلط کی طرح مٹا دے گا کہ مجھے کوئی

شکست نہیں دے سکتا۔ مجھے خوشی ہو رہی تھی کہ ہم نے ایک تیر سے دو نشانے لئے ہیں؛ ڈھونڈھ رہے تھے عاشور کو مظاہرہ کرنے والوں کو اور مل گیا۔۔۔۔

سینٹر پہنچ کر میں نے اسے انفرادی سیل لیجانے کو کہا اور خود تیزی سے سیڑھیاں چڑھ کر ہیڈ کے کمرہ میں جا پہنچا' سر عاشور کے دن مظاہرہ اور مصری سرکس میں آگ لگانے میں ملوث افراد میں سے ہم نے ایک کو گرفتار کر لیا ہے، وہی جس کے بارے میں، میں نے بتایا تھا۔

کہنے لگا' میں نیچے آ کے دیکھتا ہوں کس طرح کا آدمی ہے'۔

'ابھی کچھ پتہ نہیں؛ یا تو بالکل معاملہ سے دور ہے یا اپنے سے بہت زیادہ مطمئن'۔

'جلدی معلوم کرو کہ کیا ہے'۔

'آپ مطمئن رہئے سر! جیسے بھی ہوا میں اس کی زبان کھلواؤں گا، میرے سامنے تو اچھے اچھے۔۔۔'۔

میں حسین کی سیل کے پاس پہنچا۔ دروازہ کے اوپر والے روشندان سے جھانکا تو دیکھا کہ زمین پر بیٹھا ہوا ہے۔ سنتری سے میں نے کہا کہ اسے تفتیش والے کمرہ میں لے آئے۔ ہیڈ اسے دیکھتے ہی مجھے گھورنے لگا گویا پوچھ رہا ہو کہ غلطی سے تو نہیں کسی کو پکڑ لائے ہو؟ حسین کی قد و قامت سے اسے بھی حیرانی ہوئی۔ اب تک جتنے لڑکے ہم نے پکڑے تھے ان میں سب سے چھوٹا تھا۔

ہیڈ بولا 'تو تمہیں ہو جس نے اتنی آگ لگا رکھی ہے'۔

حسین نے کہا 'مجھے نہیں معلوم آپ کیا کہہ رہے ہیں'۔

میں نے کہا 'خوب معلوم ہے، پتہ ہے یہاں کیوں لائے گئے ہو'؟

بولا 'نہیں معلوم، آپ لوگ بتایئے'۔

میں نے کہا 'میں تمہاری زبان کھلوا کے رہوں گا، تمہیں ابھی پتہ نہیں ہے کہ کہاں لائے گئے ہو'۔

ہیڈ کہنے لگا' اسے پریشان نہ کرنا۔ مجھے یقین ہے کہ ان لوگوں کو کسی نے دھوکہ دیا ہے، جیسے ہی اصل آدمی کا نام بتائے چھوڑ دینا'۔

میں نے کہا' یہ تو خود اس پر منحصر ہے، میں تو ابھی اسے آزاد کرنے کے لئے تیار ہوں' اور اس پر ایک نگاہ ڈالی۔ اس کے بعد ہیڈ چلا گیا اور میں سگریٹ جلا کر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ باہر بارش ہو رہی تھی جس کی آواز باقاعدہ سنائی دے رہی تھی۔ سگریٹ ختم ہوئی تو میں نے کہا' تو کہاں سے شروعات کی جائے؟ پہلے عاشور کے دن سے شروع کرتے ہیں'۔

اس نے مجھے دیکھا لیکن کچھ بولا نہیں۔

'بولتے کیوں نہیں، میں انتظار کر رہا ہوں'۔

'عاشور کے دن کیا ہوا تھا، آپ کیا کہنا چاہتے ہیں'؟

'تم خود جانتے ہو'۔

'میں کچھ نہیں جانتا'۔

'تو میں کہوں کہ اس دن تم لوگوں نے اعلیٰ حضرت کی توہین کی جس کی آج تک کوئی ہمت نہیں کر سکا اور اس پر تمھیں پھانسی پر لٹکا دوں'۔

'ہم نے اس دن صرف امام حسینؑ کی عزاداری کی۔ عزاداری کرنا تو کوئی جرم نہیں ہے نا'؟

'تم اس سب کو عزاداری کہہ رہے ہو اور وہ بھی جسے اس انداز سے ختم کیا'؟

'کس انداز سے'؟

'مجسمہ کا طواف کیوں نہیں کیا'؟

'یہ کام ضروری تھا کیا'؟

'ادھر ادھر کی بات نہ کرو۔ تم اس شہر کی روایت جانتے ہو، اس کے بر عکس اگر کوئی چوک کی طرف جائے اور ٹھیک مجسمہ سے تھوڑا پہلے راستہ بدل لے اسے کیا کہا جائے گا'؟

'نہیں معلوم'۔

'معلوم ہو جائے گا'۔

میں نے یعقوب کو بلایا اور دونوں نے اسے پیٹنا شروع کر دیا البتہ اس احتیاط سے کہ چہرہ اور پیشانی پر نشان نہ پڑیں لہٰذا ٹانگوں اور پسلیوں پر لاتیں چلانے لگے۔ جب گر تا تو اسے اٹھاتے اور پھر لات گھونسے سے فٹ بال کی طرح ایک دوسرے کی طرف اچھال دیتے۔ وہ کبھی چلاتا، کبھی یا حسین کہتا اور کبھی دانت کاٹتا۔ میں نے پوچھا' اب بولو گے یا نہیں؟ تم کیا سوچ رہے ہو کہ ہمیں کچھ پتہ ہی نہیں ہے؟ بیوقوف! تمہیں پتہ نہیں کہ تمہارے ساتھیوں نے سب کچھ بتا دیا ہے؟ ہمیں صرف عاشور کے مظاہرہ ہی کی نہیں بلکہ یہ بھی خبر ہے کہ مصری سرکس کو بھی تمہیں نے آگ لگائی تھی'۔

پھر ہم نے اسے مارنا بند کیا اور غور سے اس کا چہرہ پڑھنے کی کوشش کی۔ میں سوچ رہا تھا کہ آخری جملہ نے اسے اندر سے ہلا دیا ہو گا اور سمجھ گیا ہو گا کہ ہم بیکار کچھ نہیں کہہ رہے ہیں بلکہ ہمیں سب پتہ ہے لیکن اس نے تب بھی کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا۔

مجھے اتنی کوفت ہو رہی تھی کہ پاگل ہوا جارہا تھا۔ اسے کرسی بٹھا کر پوچھا 'اب بھی کچھ نہیں بتاؤ گے'؟ لیکن وہ ویسے ہی خاموش اور مطمئن۔

میں کچھ دیر اسے دیکھتا رہا، چہرہ پر کچھ پڑھنا ناممکن تھا۔ کیا اس نے واقعاً مزاحمت کا ارادہ کر لیا تھا؟ میں نے کہا 'لگتا ہے تمہیں خود کو تکلیف دینا اچھا لگتا ہے، اپنے کو فضول میں ایذائیں دینا چاہتے ہو'؟ سوچ رہے ہو کہ ٹارچر بس یہی دو گھونسے چار لاتیں ہیں۔ نہیں! اب ہم ایسی چیز آزمائیں گے کہ جس کا مجھے یقین ہے تم نے نام تک نہ سنا ہو گا؛ برقی کرسی! ابھی تمہیں پتہ چلے گا کہ اس کرسی کا کام کیا ہے لہٰذا اگر ہمارے دیگر ذرائع بھی جاننا چاہتے ہو تو اس پر مزاحمت دکھانا'۔

یہاں تو مزاحمت نہیں کی جا سکتی تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ بہت جلد سب کچھ بتائے گا۔ میں نے یعقوب کو بلا کر کہے کہ کرسی تیار کرے۔ تیار کرنے کے بھی اتنے مراحل تھے کہ قیدی کو ایک ایک کا مزہ چکھنا ہوتا تھا۔ اگر کسی کو سیدھے کرسی پر بٹھا کر اس میں بجلی دوڑا دی جائے تو چونکہ اسے پتہ نہیں کہ یہ کرسی کیا

چیز ہے لہٰذا جب براہ راست اس کی ایذاؤں کا سامنا کرتا تو شاید جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا۔ البتہ جب اس کے سامنے کرسی تیار کی جاتی تو اسی سے اس کی مزاحمت ٹوٹ جاتی اور اسے یہ سوچنے کا موقع ملتا کہ اس وقت اس کا حال اس بھیڑ کا ہے جسے بھوننے کے لئے اس کے ہاتھ پیر باندھے جارہے ہوں لیکن حسین نے زبان نہ کھولی۔ دن اپنے اختتام کو پہنچ رہا تھا، میرا تھکن سے برا حال تھا، اعصاب جواب دے چکے تھے اور اب یہ میں تھا جو اس کے سامنے اعتراف کر رہا تھا۔

'ہمیں سب پتہ ہے ہم صرف سب کچھ تمہاری زبان سے سننا چاہتے ہیں۔ تمہارے ساتھیوں نے سب کچھ تفصیل سے بتادیا ہے۔ ہمیں پتہ ہے کہ تم لوگوں نے احتجاجاً مصری سرکس کو آگ لگانے کا پروگرام بنایا، تم نے اور تمہارے دوستوں نے جو ابھی ہماری قید میں ہیں۔ اگر کہو تو اور تفصیل سے بتاؤں'۔

کانپ رہا تھا اور ہونٹ کے ایک طرف سے خون بہہ رہا تھا لیکن لگتا تھا کہ میری باتیں غور سے سن رہا ہے۔

تم لوگوں نے آپس میں کام بانٹ لئے تھے۔ تخریب کاری کا منصوبہ تم نے بنایا تھا۔ دوسروں کا کہنا تھا یہ ممکن نہیں ہے لیکن تم نے کہا کہ سرکس کو آگ لگائی جاسکتی ہے لیکن یہ کام ایسے وقت میں ہونا چاہئے جب وہاں کوئی نہ ہو تاکہ کسی کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔ پھر تم خود جگہ کا معائنہ کرنے گئے۔ ایک دوبار چوبیس میٹر والی روڈ کی طرف گئے لیکن تم نے ادھر سے سرکس کے نزدیک آنا مناسب نہیں سمجھا اور اس کی وجہ بھی میں تمہیں بتا سکتا ہوں۔ وجہ یہ تھی کہ اسی روڈ پر آریا سینما ہے جہاں ہر وقت لوگوں کی آمد و رفت رہتی ہے لہٰذا تم نے سوچا کہ ادھر سے کوئی تمہیں دیکھ لے گا جو بعد میں تمہیں پھنسا سکتا ہے لہٰذا تم نے پیچھے والی روڈ کا انتخاب کیا۔ زینبیہ والی روڈ پر تم سائکل سے آتے جاتے تھے اور جس دن تم نے وہ حرکت کی اس دن بھی سائکل سے گئے تھے۔ پتہ چلا؟ مجھے چھوٹی چھوٹی چیزیں بھی پتہ ہیں اب باقی بھی میں بتاؤں یا تم بتاؤ گے۔ اب تو اس کے پاس مزاحمت کی کوئی وجہ نہیں ہونی چاہئے تھی

لیکن اس کے باوجود وہ کچھ نہیں بولا اور ہماری یہ حسرت ہرگز پوری نہ ہوئی کہ وہ کسی ایک کا نام لے لے۔ اس کے بعد ہم ہر دن نیا ہتھکنڈہ اپناتے تھے، الٹا بھی لٹکاتے رہے لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ تلووں پر اتنے ہنٹر مارے کہ اس کا قد دس سینٹی میٹر بڑھ گیا۔ اس کے بعد ہم اسے ڈھیر سارا سپنج دیتے تھے کہ جوتوں میں رکھ کر چل سکے۔

اس دن میں ٹوٹ گیا، بری طرح سے! اور وہ بھی ایک سولہ سالہ لڑکے کے ہاتھوں جو کہ میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ کون تصور کر سکتا تھا کہ جس معبر کے نام سے لوگ لرز اٹھتے ہیں وہ ایک نوجوان سے ہار جائے گا؟ شاید میرے زوال کے دن شروع ہو چکے تھے لیکن میں خود نہیں سمجھ پایا تھا۔ مجھے اسی دن سمجھ جانا چاہئے تھا کہ میں اب ایسا پھنسا ہوں کہ نکل نہیں پاؤں گا۔ آج جو سامنے آیا ہے اس کی نشانیاں چار سال پہلے ظاہر ہو چکی تھیں لیکن میں سمجھ نہیں پایا تھا۔ جج نے پوچھا تم نے کیوں یہ سب کیا؟ اور یہ سوال اس سے پہلے مجھے اپنے سے پوچھنا چاہئے تھا اب آج تو افسوس بھی کسی کام کا نہیں۔ لیکن اُس وقت میری دل کی آنکھیں پھوٹ چکی تھیں میں سوچتا تھا کہ اگر کسی نوجوان

نے میرے ناقابل شکست ہونے کو چیلنج کر دیا ہے تو مجھے اسے زیادہ سے زیادہ ایذائیں دینی چاہیئے اگرچہ مجھے پتہ تھا کہ وہ کچھ نہیں بولے گا۔ لیکن اس طرح شاید میں اپنی شکست کا تلخ تجربہ بھلا سکوں یا اندر کا غصہ ٹھنڈا کر سکوں۔ میں یہ بھولنا چاہتا تھا کہ میں ہی ہمیشہ نہیں جیتتا، میں یہ چاہتا تھا کہ۔۔۔ کیا اس سے بہتر نہیں تھا کہ اس نوجوان اور اس کے ساتھیوں کے جذبات سمجھتا؟ اس میں اتنی باطنی طاقت کہاں سے آئی تھی کہ بدترین ایذائیں بھی اس کی زبان نہ کھلوا سکیں؟ وہ اُٹھ تک نہیں سکتا تھا لیکن اپنے کو کھینچ کھینچ کر پانی تک پہنچتا اور وضو کرکے نماز پڑھتا یا دعا کرتا تھا، کیوں؟ کم سے کم اسی کی وجہ معلوم کرتا! کیا وہ یہ بھی نہ بتاتا؟ اتنے قیدیوں میں صرف علم الہدیٰ کا چہرہ ہی کیوں بار بار میری آنکھوں کے سامنے آرہا ہے؟ اس کی وجہ آج صبح کی اس کی سخت نگاہیں تو نہیں؟

جب جج نے کہا کہ علم الہدیٰ صاحب ہمیں پتہ ہے کہ ملزم نے آپ کو کئی بار سخت ایذائیں دی ہیں۔ آپ براہ کرم تفصیل سے بتایئے کہ ملزم نے آپ کو کیسی کیسی ایذائیں دی ہیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ حسین کے لبوں پر فاتحانہ

مسکراہٹ ہو گی، میں سوچ رہا تھا کہ آج جب اس کا اس شخص سے سامنا ہو رہا ہے جس نے اسے ٹارچر کیا ہے اور وہ بھی اس حال میں کہ وہ ستم پیشہ ایک ذلیل و حقیر شے میں بدل چکا ہے نہ اس کے پاس کوئی طاقت ہے اور نہ اختیار تو اس کی آنکھوں میں انتقام کی چمک ہو گی۔ لیکن حسین ویسے کا ویسا ہی تھا، جیسے کچھ بدلا ہی نہ ہو، جیسے غالب اور مغلوب کی جگہ تبدیل ہی نہ ہوئی ہو۔ اس نے جج سے بس اتنا کہا کہ 'اس کے ساتھ وہی سلوک کیجئے جو قانون کہتا ہے'۔

اس نے یہاں تک کہ یہ بھی نہیں بتایا کہ میں نے اس کے ساتھ کیا، کیا ہے۔ اس کی آواز میں نہ مجھ سے نفرت تھی اور نہ اپنی کامیابی پر خوشی۔ وہ وہی شخص تھا جس کی حقیقت میں پتہ نہیں لگا سکا تھا۔ وہ اس قدر مطمئن تھا کہ مجھے یقین تھا کہ اگر میں اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دوں تو میری معمولی سے درخواست پر ہی اپنے حق سے دستبردار ہو جائے گا اور مجھے معاف کر دے گا لیکن اگر وہ معاف بھی کر دیتا تب بھی کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ اس لئے کہ مدعی بہت تھے وگرنہ مجھے اس کے پیروں پر گر کر معافی مانگنے اور خود کو ذلیل و رسوا کرنے میں کوئی قباحت محسوس نہ ہوتی۔ اور یہ کوئی نئی بات بھی نہ تھی اس

لئے کہ میں نے جب بھی اس کی زبان کھلوانے کی کوشش کی اس کی پہاڑ جیسی استقامت نے میرا منہ چڑھا دیا اور میں ذلیل ہو کر رہ گیا۔ جب ۱۹۷۲ء ہم نے اسے پہلی بار میں پکڑا تو مجھے اس کے سامنے خوار ہونا پڑا لیکن یہ پہلی اور آخری بار نہیں تھی۔ ہم نے جتنی بار اسے گرفتار کیا اتنی بار میرا ایسی حال ہوا۔

۱۹۷۲ میں مجھے ٹھیک سے یاد نہیں کہ اس کی تفتیش کتنے دن چلتی رہی۔ بس اتنا یاد ہے کہ آخر میں، اس نے مجھے اس قدر بے حال کر دیا تھا کہ میں اسے دیکھنا تک نہیں چاہتا تھا اس لئے کہ اسے دیکھ کر مجھے یاد آجاتا تھا کہ اسی نے مجھے ہرایا ہے۔ دوسری طرف مجھے یہ خوف بھی تھا کہ کہیں ایذاؤں کی تاب نہ لاکر جان نہ دے دے، اس سے اور پریشانی کھڑی ہو جائے گی۔ آیت اللہ علم الہدیٰ کے بیٹے کی موت کوئی معمولی بات نہیں ہو گی۔ اگر شہر میں خبر پھیل گئی کہ آیت اللہ علم الہدیٰ کا بیٹا ساواک کے ہاتھوں قتل ہو گیا ہے تو لوگوں کو کون روکے گا۔ شہر کا نظام درہم برہم ہو جائے گا اور لوگ بغاوت پر اتر آئیں گے۔ اس لئے ہم نے ہار مان لی اور کچھ عرصہ بعد اسے زند جیل منتقل کر دیا۔ اب چونکہ اس کی عمر صرف سولہ سال تھی لہٰذا اسے نہ تو سیاسی قیدیوں

کے سیل میں رکھا جا سکتا تھا اور نہ بڑے قیدیوں کے اس لئے اسے لڑکوں کے سیل میں رکھا گیا۔ وہاں جرائم پیشہ لڑکوں کو رکھا جاتا تھا یعنی ان لڑکوں کو جو چوری، ڈکیتی، قتل یا مارپیٹ وغیرہ کے الزام میں گرفتار کئے جاتے تھے۔

حسین کو اس طرح کے لوگوں کے ساتھ رکھنا ہی اسے تڑپانے کے لئے کافی تھا۔ وہ بہت برے لوگ تھے؛ بات بات پر لڑتے تھے، دوسروں سے بھتہ لیتے تھے، کمزور قیدیوں سے اپنے نجی کام کرواتے اور بگار لیتے تھے۔ ہم نے سوچا دبلا پتلا حسین ان سے کیا اپنا بچاؤ کر پائے گا کچھ ہی دن میں اکتا جائے گا اور شاید پھر خود چل کر کمرۂ تفتیش میں حاضر ہو اور ہر چیز کا اعتراف کر لے۔ اس طرح ہمارا کام بھی کم ہو جائے گا لیکن حسین کی زند جیل منتقلی کے بعد وہاں سے عجیب وغریب خبریں آنے لگیں؛ اسے نہ صرف یہ کہ وہاں کوئی پریشانی نہیں ہے بلکہ اس نے دوسرے قیدیوں کے ساتھ دوستی بھی کرلی ہے، یقین نہیں آرہا تھا۔ حسین ایسے نیک خصلت نے کیونکر ان بد ذہن قیدیوں سے دوستی کرلی ہے؟ یہ میرا وہاں جا کے دیکھنا ضروری تھا۔ اگلے دن جب میں نے جیل کا معائنہ کیا تو مجھے پتہ چلا کہ رپورٹیں صحیح تھیں، حسین کا باقی قیدی

احترام کرتے ہیں۔ یقین نہیں آرہا تھا، وہ کیسے ان کے ساتھ رہ پا رہا ہے؟ وہ تو اپنے خیالات سے دستبردار ہونے والے آدمی نہیں تھا۔

تو کیا ہوا ہے؟ کیا یہ غنڈہ صفت قیدی اس سے دب گئے ہیں لہٰذا اس سے کوئی مطلب ہی نہیں رکھتے بلکہ احترام بھی کرتے ہیں؟ لیکن اس کی قد و قامت اور دبلے پتلے جسم سے لگتا تو نہیں تھا کہ اس نے ان پر اپنا رعب جما لیا ہو۔ بہرحال میں نے جیل سپرنٹنڈنٹ سے پوچھا:

'حسین علم الہدیٰ نے اب تک کبھی کسی سے لڑائی کی ہے'؟

'جہاں تک میں جانتا ہوں، نہیں'۔

'دوسرے قیدی اس سے ڈرتے ہیں'؟

'میرے خیال میں نہیں'۔

'تو اس کا اتنا احترام کیوں کرتے ہیں'؟

'نہیں معلوم'۔

'تمہیں میں صرف دو دن کا وقت دیتا ہوں پتہ لگاؤ ایسا کیوں ہے ؟ تمہیں سیل کے جملہ داخلی امور کی خبر ہونی چاہئے۔ اگر تم سے یہ ممکن نہیں تو بتا دو تمہاری جگہ یہ کام کسی اور کو سونپیں گے۔ خبریں الگ طرح کی مل رہی ہیں'۔

'بسر و چشم! میں ابھی سے چوبیس گھنٹے اس پر نظر رکھوں گا تاکہ پتہ چلے کہ اس کی مقبولیت کی وجہ کیا ہے'۔

ابھی دوسرا دن مکمل نہیں ہوا تھا کہ وہ آن پہنچا۔

'سب پتہ چل گیا ہے سر'۔

'کیا پتہ چلا ہے'؟

'حسین جب ایسی وضع قطع کے ساتھ سیل میں داخل ہوا تو باقی سارے قیدیوں نے سوچا کہ اس نے کوئی بہت بڑا جرم کیا ہے تبھی اس کا یہ حال کیا گیا ہے، یقیناً کوئی چھٹا ہوا مجرم ہے۔ لیکن جلد ہی انہیں پتہ چل جاتا ہے کہ حسین کسی اور خاصیت کا ہے۔ جب دیکھتے ہیں کہ وہ قرآن پڑھتا ہے، ہر روز نماز

پڑھتاہے، دوسروں سے مہربانی سے پیش آتاہے تو سمجھ گئے وہ کس قسم کا آدمی ہے'۔

اس کے بعد وہ خاموش ہو گیااور میں نے پوچھا'بس یہی'؟

'اتناہی نہیں سر! اس نے بہت سے قیدی اپنے سے ملحق کر لئے ہیں۔ آپ کو یقین نہیں آئے گا کہ کیسے کیسے غنڈوں کو اس نے نمازی بنادیا ہے'۔

'لعنت ہے تم سب پر'!

میں نے سوچا کہ اس نے تو یہاں ہنگامہ کرر کھا ہے۔ ممکن ہے مستقبل قریب میں انہیں نوجوانوں کی مدد سے اپنا ایک اور گروہ بنالے۔ مجھے پتہ تھا کہ اس میں دوسروں کو اپنی طرف کھینچنے اور ان کی رہنمائی کی طاقت ہے، ان سے اپنی بات منوا سکتا اور انہیں اپنے سے متأثر کر سکتا ہے۔ نہ تو اس نے عاشور کے دن کے مظاہرہ ہی کا اعتراف کیا ہے اور نہ ہی سرکس میں آگ لگانے کا جبکہ نادر اور عماد کے اعترافات گواہ ہیں کہ یہ ساری حرکتیں اسی کی تھیں۔

میرا خون ابل رہا تھا۔ تیزی سے جیل کی طرف دوڑا اور سیدھے لڑکوں کے سیل میں داخل ہو گیا۔ مجھے یہ کھیل ہر قیمت پر روکنا تھا اور حسین اوراس کے ہمنواؤں کو سبق سکھانا تھا۔ جب مجھے پتہ چلا کہ اس نے صرف اچھے خاصے لڑکوں کو نمازی ہی نہیں بنا دیا بلکہ انہیں جماعت سے نماز پڑھاتا ہے تو میں غصہ سے آگ بگولہ ہو گیا۔

سیل کا دروازہ کھلتے ہی میں نے اسے لاتوں گھونسوں سے پیٹنا شروع کر دیا اوراتنا پیٹا کہ خود میری سانس پھولنے لگی۔

'یہاں بھی باز نہیں آئے، کیا چاہتے ہو ہم سے'؟

شور سن کر سارے قیدی اکٹھا ہو گئے تھے اور غور سے ہمیں دیکھ رہے تھے، کسی کی آواز نہیں نکل رہی تھی بس خاموشی سے دیکھے جا رہے تھے۔

حسین زمین پر پڑا تھا۔ میں نے جیلر سے کہا کہ اسے کھڑا کرے۔ جب وہ کھڑا ہوا تو میں دوبارہ اس پر لاتوں گھونسوں سے ٹوٹ پڑا۔ میں نے اس سے کچھ پوچھا نہیں اس لئے کہ معلوم تھا کہ بولے گا نہیں۔ جب وہ گر کر بالکل بے

حال ہو گیا تب جا کر میں نے اسے چھوڑا۔ اس کے بعد راڈ کی ٹیک لگا کر کھڑا ہوا اور سگریٹ جلالی۔ اتنی طاقت لگائی تھی کہ سخت ٹھنڈک کے موسم میں پسینہ میں ڈوب گیا تھا، حسین کے بجائے میں گرا جا رہا تھا۔ جیلر حکم کا منتظر مجھے دیکھے جا رہا تھا۔ آخر جب اس سے رہا نہ گیا تو پوچھنے لگا 'سر! اسے اس کے سیل میں چھوڑ دوں'؟

'نہیں! کہاں لے جاؤ گے اسے۔ ابھی تو میرا کام شروع ہوا ہے، مجھے اسے دکھانا ہے کہ دوسروں کو گمراہ کرنے کا انجام کیا ہوتا ہے، ہماری جیل کو بھی مسجد سمجھ رکھا ہے اس نے'۔

جیلر کو اسے وہیں رکھے رہنے کی ہدایت دے کر میں اس کے سامان کی تلاشی لینے اس کے سیل میں چلا گیا، بڑی دلچسپ چیزیں ملیں؛ سجدہ گاہ، تسبیح، قرآن۔ قرآن اسے کس نے وہاں لا کر دیا تھا؟ میں سیل کے سنتریوں کی طرف دوڑا اور انہیں ڈانٹنے لگا۔ معلوم ہوا کہ قرآن اسے اس کے بھائی نے ہی پہلی ملاقات میں لا کر دیا تھا جو اس نے خود طلب کیا تھا۔

دوبارہ اس کے پاس پہنچا اور اسے لگاتار کئی طمانچے رسید کرنے کے بعد کہا کہ اسے صحن میں لے جایا جائے۔ مجھے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اسے کیا سزا دوں اس لئے کہ مارنے سے کچھ حاصل نہیں تھا، اس سے الٹا میں ہی تھکتا تھا۔ صحن میں مجھے ایک درخت نظر آیا، سردی کا موسم تھا اور شدید ٹھنڈک ہو رہی تھی تو میرے ذہن میں آیا کہ سب سے سستا اور آسان کام یہ ہے کہ اسے ٹھنڈک میں درخت سے باندھ دینے کا حکم دے دوں۔

میں نے بلند آواز میں سب کو سنا کر جیلر سے کہا 'رسی! رسی چاہئے مجھے'۔

جیلر ایک لمحہ کے لئے چکرا گیا، بیچارہ سوچنے لگا کہ میں اسے سولی پر لٹکانا چاہتا ہوں لہٰذا عجیب نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

'مر گئے ہو کیا؟ سنا نہیں تم نے'؟

'بسر و چشم سر! لیکن کتنی بڑی'؟

'جتنی بڑی لا سکتے ہو'

تھوڑی دیر میں وہ سات آٹھ میٹر کی رسی اٹھالایا۔

'اسے لے جاکر کس کے درخت سے باندھ دو، ہلنے نہ پائے'۔

وہ شاید اہواز کی سب سے سرد رات تھی اور سہ پہر سے سخت تیز ہوائیں بھی چل رہی تھیں، ایسی ہوائیں کہ جن سے آنکھ سے آنسو نکلنے لگتے اور ناک میں جلن ہونے لگتی تھی۔ میں نے سوچا سردی اسے ٹھیک کر دے گی۔ جانتا تھا فائدہ تو کچھ نہیں ہے لیکن پھر بھی چلایا 'جب عقل ٹھکانہ آجائے تو مجھے بلا سکتے ہو'۔

ایک دو گھنٹے میں جیل میں ہی رہا۔ واضح تھا کہ حسین ہار ماننے والا نہیں ہے۔ جب میں گھر لوٹنے لگا تو جیلر نے پوچھا کب تک اسے ایسے ہی رہنے دیں'؟

'جب تک مر نہ جائے'۔

وہ جانتا تھا یہ میرا 'حکم' نہیں ہے۔ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ اسے آدھی رات تک اسی حال میں رکھا گیا تھا۔ شاید ایک دو بار بے ہوش بھی ہو گیا تھا۔ اس کے بعد

ہم نے اسے سیاسی قیدیوں کے سیل میں منتقل کر دیا، کوئی چارہ ہی نہیں تھا، وہ نوجوانوں کو گمراہ کئے جارہا تھا۔ اس کے بعد بھی جب تک وہ جیل میں رہا تقریباً چار مہینے تک کبھی کبھار مجھے دکھائی دے جاتا تھا۔ اس کا دکھائی پڑنا میرے لئے سوہان روح ہوتا تھا، مجھے یاد آجاتا کہ میں کمزور ہوں۔ جب وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالتا تو مجھے اتنی ہی لاچاری محسوس ہوتی جتنی آج ہو رہی ہے۔ ان گہری اور متأثر کن نگاہوں کے پیچھے کیا تھا؟ وہ کیا سوچتا تھا؟ کیا اسے پتہ تھا کہ ایک دن ایسا بھی آئے گا؟ کیا وہ جانتا تھا کہ ایک دن پھر میرا اور اس کا سامنا ہوگا لیکن اس حال میں کہ میں مجرم ہوں گا اور وہ مجھ سے تفتیش کر رہے ہوں گے؟

میرا بھی بہت دل چاہا کہ کسی سوال کا جواب نہ دوں تا کہ دیکھوں کہ یہ لوگ کیا کرتے ہیں۔ کیا وہ بھی ملزم کی زبان کھلوانے کے لئے ہمارے والے طریقے اپنائیں گے؟ میں نے سنا تھا کہ وہ اس طرح کے طریقوں پر یقین نہیں رکھتے۔ میرے ساتھ انہوں نے بس اتنا کیا کہ جب پہلی بار انہوں نے دیکھا کہ میں کچھ نہیں بول رہا ہوں تو کہنے لگا کہ اسے اس کے سیل واپس لے جاؤ، جب

تک اسے کچھ کہنا نہ ہو تب تک اسے مت لاؤ۔ لیکن میں کب تک صبر کرتا، مطلب یہ کہ صبر کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا، پانی میرے سر سے اونچا ہو چکا تھا اور میری مزاحمت جواب دے چکی تھی۔ دھوکہ دینے اور چہرہ سے کچھ اور ظاہر کرنے کے طریقے جو ہمیں اسرائیل میں سکھائے گئے تھے بیکار ثابت ہوئے۔

شاید اگر میرا حسین علم الہدیٰ سے سامنا نہ ہوا ہوتا تو میں آخر تک مزاحمت کرتا۔ جب انہوں نے کہا کہ اسے اس کے کمرہ میں لے جاؤ اور جب تک اس کے پاس کہنے کو کچھ نہ ہو تب تک مت لاؤ تو ممکن تھا کہ میں کبھی بھی نہ بولتا اور اس طرح اتنی جلدی میرا سر تختۂ دار کی نذر نہ ہوتا لیکن علم الہدیٰ نے اپنی مزاحمت کے ذریعہ مجھے اندر سے چکنا چور کر دیا تھا اور میں کتنا بدقسمت تھا جسے چار سال میں کئی بار اس کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ آخری بار کب اس سے ملا تھا؟ میرا خیال ہے جب ہنگامہ آرائیاں اپنے عروج پر تھیں اور ایک گشتی پارٹی نے اسے کارون کے پاس سے گرفتار کیا تھا۔ اس وقت اس کے پاس تو کچھ نہیں تھا ڈیوٹی پر مامور اہلکاروں کو اس پر شک ہو گیا تھا، شاید وہ ان کی گاڑی کے کافی

قریب آ گیا تھا۔ لیکن وہ بھی آخری بار نہیں تھی۔ مجھے یاد ہے اس بار اس کے خلاف کوئی ثبوت نہ ہونے کی بنا پر ہمیں بہت جلد اسے چھوڑنا پڑا تھا۔

جیلیں بھری ہوئی تھیں اور کسی چھوٹی سی بات پر کسی کو جیل میں ڈالنا ممکن نہیں تھا۔ ان دنوں میں بہت مصروف تھا۔ مجھے عراقی قونصل خانہ پر ہوئے حملہ کی چھان بین پر مامور کر دیا گیا تھا۔ عراقی قونصل خانہ اگرچہ سخت حفاظتی حصار میں تھا لیکن نہیں معلوم کیسے ہمیں بھی یقین نہیں آیا کہ جب آیت اللہ خمینی کو عراق سے نکل جانے کا حکم ملا تو قونصل خانہ پر حملہ ہو گیا۔ یہ تو پتہ تھا کہ لوگ عراقی حکومت سے خفا ہیں اور عام لوگوں یا خوزستان میں سرگرم مختلف گروہوں کی جانب سے عراقی مفادات کو زک پہنچائے جانے کا امکان تھا لیکن یہ تو ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ خرم شہر میں واقع عراقی قونصل خانہ پر بھی حملہ ہو سکتا ہے وہ بھی جب شہر فوج کے اختیار میں ہے اور قونصل خانہ کی عمارت کے اطراف میں سلامتی اہلکاروں کی نفری بڑھا دی گی گئی ہے لیکن ایک رات اس پر حملہ ہو گیا۔ موصولہ رپورٹوں کے مطابق حملہ آور تین تھے۔ حملہ میں قونصل خانہ کی عمارت پوری طرح جل گئی تھی لیکن کسی

ڈپلومیٹ کو کوئی نقصان نہیں ہوا تاہم باہر حفاظت پر مامور ایک شخص ہلاک اور ایک زخمی ہو گیا۔

کاروائی شروع ہونے کے تقریباً پانچ منٹ بعد ہمیں خبر ملی۔ امدادی عملہ فی الفور حرکت میں آگیا اور آدھے گھنٹہ کے اندر اندر جائے وقوعہ پر پہنچ گیا لیکن تب تک سب کچھ ہو چکا تھا اور حملہ آوروں کا کوئی اتہ پتہ نہ تھا۔ ہر طرف گولیوں کے خول بکھرے تھے اور درودیوار پر فائرنگ کے نشانات نظر آرہے تھے۔ زخمی گارڈ اپنے آپ کو کھینچ کر عمارت کے اندر لے گیا تھا اور اتنے پورے راستہ میں خون تھا۔ ہم نے فوری طور پر قونصل خانہ کے اطراف کی سڑکوں پر پہرہ بٹھا دیا، خرم شہر سے آبادان جانے والی سڑک بند کر دی، چند کشتیاں بھی نہر میں روانہ کیں لیکن حملہ آوروں کا کچھ پتہ نہیں چلا۔ نہیں معلوم انہیں آسمان کھا گیا تھا یا زمین نگل گئی تھی۔ اس دن مجھے پتہ نہیں چلا کہ اس حملہ میں بھی حسین علم الہدیٰ کا ہاتھ ہے اور یہ بھی نہیں پتہ تھا کہ گورنر کی رہائش گاہ کے سامنے ہونے والی جھڑپ کے دوران گرفتار ہونے والا شخص بھی حسین ہی ہے اس کا بھائی حمید نہیں۔ اس نے اپنا نام حمید اس لئے بتایا تھا کہ

اس سے پہلے دوبار گرفتار ہو چکا تھا اور فوجی حکومت میں تیسری گرفتاری کے معنی پھانسی ہوتے ہیں۔ اگرچہ پھانسی کے لئے تو وہی جرم کافی تھا اور پھانسی ہو بھی جاتی اگر موقع ملتا۔ لیکن افسوس! اس سیلاب نے بہت جلد سب کچھ تباہ کر دیا اتنی جلدی کہ ہم کو سوچنے اور حساب بے باق کرنے کا بھی موقع نہ ملا۔ جب تک میں سنبھلتا لوگ ٹوٹ پڑے اور مجھے گرفتار کر لیا۔ نہ کسی کے دل میں میرا اڈالا ہوا ڈر تھا نہ خوف۔ مجھے پتہ تھا کہ اب مجھ سے انتقام لینے کا وقت آگیا ہے جس سے میں بچ نہیں سکتا۔ اب میرا دل چاہتا ہے کہ وہ لمحہ، وہ لمحہ کہ جس سے فرار ممکن نہیں جلد آن پہنچے۔

دوسری کہانی

محترم! آپ نے میرے پاس لکھا ہے کہ آپ حسین علم الہدیٰ پر ایک کتاب لکھنا چاہتے ہیں اور اس کے لئے مواد اکٹھا کر رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے یہ کام ممکن ہو لیکن آپ یہ نہ بھولئے گا کہ حسین کا کسی کتاب میں احاطہ نہیں کیا جا سکتا، یہ اسے محدود کرنا ہے اور ایسی کوئی بھی کوشش ناانصافی ہے۔ لیکن آپ بھی یہ بیڑا اٹھانے میں حق بجانب ہیں لہٰذا اپنی کتاب میں یہ نوٹ ضرور لگایئے گا کہ جو کچھ آپ نے حسین کے بارے میں لکھا یا دوسروں نے بیان کیا اور آپ نے لکھا ہے اس سے آپ کی شخصیت کا صرف ایک پہلو اجاگر ہو سکتا ہے پوری شخصیت نہیں۔ اگر یہ نوٹ نہ لگایا جائے تو میرا خیال ہے کہ یہ ان پر ظلم ہو گا۔

مجھے مبالغہ آرائی کی عادت نہیں ہے اور نہ ہی میرے خیال میں حسین علم الہدیٰ جیسے عظیم شہید کی شخصیت سے متعلق مبالغہ سے کوئی فائدہ ہے لیکن میں دل کی گہرائیوں سے یہ اعلان کر رہا ہوں کہ حسین ایک ناقابل یقین شخصیت کا نام ہے اور یہ بات وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو انہیں جانتے تھے اور ایسے لوگ مختلف شہروں میں مل سکتے ہیں۔ ان سے ملنے کے بعد آپ کو میری بات کا یقین آ جائے گا۔

آپ حقیقی معنی میں ہر فن مولا تھے، ثقافیات، عسکریت، منصوبہ بندی، تنظیم و ترتیب، بہترین اخلاق اور نہ جانے کس کس فن میں ممتاز تھے۔ دلچسپ یہ کہ اگر کوئی کسی ایک فن کے سلسلہ میں انہیں جانتا تھا تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ کسی اور فن میں اسی قدر ممتاز ہوں گے۔ اس لئے کہ اسی ایک فن کے سلسلہ میں انہیں اتنا عبور اور مہارت ہوتی تھی کہ سامنے والا سوچتا تھا کہ انہوں نے بہت محنت کر کے اس میں کمال حاصل کیا ہے مثلاً آپ کا سارا ہم و غم تاریخ اسلام، قرآن اور نہج البلاغہ کا مطالعہ رہا ہے اسی لئے ان میں اسقدر ماہر ہیں۔ اتنے مطالعہ کے بعد تقریر کرنے کی بھی بہترین صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے اور آپ جانتے ہیں کہ حسین سپاہ پاسداران (انقلاب محافظ فوج)، تعمیر نو جہاد، تربیت معلمین مرکز اور دیگر مقامات پر اسلامیات کی کلاسیں لگاتے تھے اور دن میں آٹھ سے دس گھنٹے پڑھایا کرتے تھے اور تدریس کی سطح اتنی بلند تھی کہ انسان حیران رہ جاتا تھا۔

بہر حال انقلاب سے پہلے کی ان سرگرمیوں پر میں روشنی نہیں ڈالوں گا؛ مصری سرکس کو نذرِ آتش کرنا، ۱۹۷۴ء میں عاشور کے دن مظاہرہ کرنا یا

دیگرکارنامے فی الوقت میرا موضوع نہیں ہیں۔ان کی تفصیلات آپ دوسروں سے جان سکتے ہیں، مجھے ان کا ٹھیک سے علم بھی نہیں ہے بلکہ مجھے اتنا ہی معلوم ہے جتنا دوسروں نے بتایا ہے۔میں یہاں انقلاب کے بعد کی حسین کی سرگرمیوں پر روشنی ڈالنا چاہتا ہوں اور وہ بھی ان سرگرمیوں پر جن کا میں خود گواہ ہوں اور زیادہ تر آپ کے شخصیت کا عسکری پہلو اجاگر کرنا چاہتا ہوں۔اگر واقعات من و عن نقل نہ کر پاؤں یا کچھ تاریخیں آگے پیچھے ہو جائیں تو معذرت خواہ ہوں۔

آج سے بیس سال پہلے کی بات ہے اور آپ جانتے ہیں کہ میں دس سال عراق میں قید رہا ہوں اور اس سخت عرصہ میں بس ایک ہی حسرت دل میں تھی کہ کیلیبر ففٹی کی گولی پیر کے بجائے سینہ میں کیوں نہیں لگی اور آخر تک حسین کے ساتھ رہنے کا موقع کیوں نہیں ملا۔

البتہ جب غور سے سوچتا ہوں تو اسی نتیجہ تک پہنچتا ہوں کہ یہی صحیح تھا؛ ہر شخص کو اس کی لیاقت کے مطابق ہی کچھ ملتا ہے۔ حسین وہاں پہنچ گئے جہاں

انہیں پہنچنا تھا اور میں وہیں رہ گیا جہاں مجھے رہنا تھا۔ آپ جانتے ہوں گے کہ انقلاب کے بعد حسین گورنر ہاؤس میں کام کرنے لگے تھے۔ وہاں ایک کمیٹی تشکیل دی گئی جس نے اپنے لئے مختلف فرائض متعین کئے تھے ان میں سے ایک صوبہ بھر میں ساواک کے ایجنٹوں کو ڈھونڈھنا اور گرفتار کرنا تھا۔ شاید آپ کے لئے یہ جاننا دلچسپی سے خالی نہ ہو کہ اسی کمیٹی کے توسط سے معبر اور سروان نبوی کی گرفتاری عمل میں لائی گئی جنہوں نے آرمی کی ڈویژن ۹۲ کے ہیڈکوارٹر میں حسین کو سخت ایذائیں دی تھیں۔ معبر وہی بدہیکل شخص تھا جس نے حسین کو سخت ترین ایذائیں دی تھیں اور برسوں سے انہیں جانتا تھا۔

اس دور میں جیسا کہ میں نے سنا ہے حسین شہر آنے جانے کے لئے ایک سادہ سی موٹر سائیکل استعمال کرتے تھے اور اس کے لئے بھی اپنے بھائی کاظم سے قرضہ لیا تھا اور ہر مہینہ قسط ادا کرتے تھے۔ شہر کے مختلف محلوں میں ان کی کلاسیں ہوتی تھیں اور وہاں جانے آنے کا ان کا ذریعہ وہی موٹر سائیکل تھی۔ کچھ عرصہ پہلے سپاہ پاسداران انقلاب (انقلاب محافظ فوج) بھی قائم ہو چکی تھی اور حسین اس کی اعلیٰ کمان کے فعال رکن تھے۔ اصغر گندمکار، رضا

پیرازادہ، سعید درخشان، صادق آہنگران اور کچھ دیگر افراد تدریس میں ان کی مدد کرتے تھے۔

اصغر گندمکار، رضا پیرزادہ اور سعید درخشان جیسا کہ آپ یقیناً جانتے ہوں گے بعد میں شہید ہو گئے۔مجھے یاد ہے کہ اسی سال حسین کو ایک بار انقلاب عدالت نے بھی طلب کیا تھا۔

اس دن انہیں ایذائیں دینے والوں کی پیشی تھی اور شاید آپ جانتے ہوں کہ آپ نے فوجی حکومت کے اس ایذارسانی کرنے والے آفیسر کو معاف کر دیا تھا اور ایک خط بھی لکھ کر اس کے ہاتھ میں تھمایا تھا۔ ۱۹۷۹ کی بہار تھی یعنی اس کے دو تین مہینے بعد جنگ شروع ہوئی تھی۔اس دوران آپ ثقافتی امور میں سرگرم رہے جس کی تفصیل بیان کرنا میرے بس کی بات نہیں ہے اور آپ نے بھی یہی لکھا ہے کہ میں چونکہ جنگ میں ان کے ساتھ تھا لہٰذا جنگ خاص طور پر صحرائے ہویزہ کی استقامت و پایداری کے تاریخی اور ناقابل

فراموش لمحات کا ذکر کروں۔ وہی صحرائے ہویزہ جہاں حسین اور ان کے مخلص ترین ساتھی شہادت سے ہم آغوش ہو گئے۔

جنگ کے باقاعدہ آغاز سے قبل ایک دن میں میں اور حسین شلمچہ گئے، مغرب سے پہلے کا وقت تھا اور سورج ہمارے پیچھے جس کی وجہ سے ہمیں سامنے اچھی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ اس دن صحرائے شلمچہ کافی پراسرار لگ رہا تھا۔ دور گرد و غبار کے تودے نظر آرہے تھے جن کی وجہ سے افق چھپ گیا تھا۔ میں نے کہا' وہاں دوری پر لگ رہا ہے کچھ ہے'۔

حسین بولے 'عراقی ہوں گے'۔

میں نے کہا' یعنی واقعاًیہ لوگ حملہ کا سوچ رہے ہیں'؟

حسین کہنے لگے 'مجھے تو اب یقین ہونے لگا ہے' اور دوربین سے سرحد کے اس پار دیکھنے لگے۔

'کچھ دکھائی دے رہا ہے'؟

جواب دیا، کچھ بھی نہیں لیکن یقیناً یہ دھول ٹینکوں اور بڑی فوجی گاڑیوں کی رفت و آمد کا نتیجہ ہے'۔

میں نے کہا، تو کیا کریں'؟

انہوں نے کہا، جب تک حکومت میں خائن لوگ ہیں تب تک ہم سے کچھ نہیں ہو سکتا ہے۔ میں نے سفارت خانہ کے ساتھیوں کو قائل کیا کہ مدنی کی خیانتیں ذرائع ابلاغ کے ذریعہ عام کی جائیں۔ اگر ایسا ہوا تو مدنی برطرف ہو جائے گا اور مخلص فوجی آفیسروں کو آگے آنے کا موقع ملے گا۔ یہ شخص تو بری طرح خیانت کر رہا ہے'۔

میں نے کہا، تم جو بتا رہے تھے کہ تمہارے ایک دوست نے مدنی کے خلاف اسناد و شواہد اکٹھا کئے ہیں ان سے کچھ نہیں ہوا'؟

جواب ملا، کیوں نہیں وہ بھی ہم نے سفارت خانہ کے ساتھیوں کے حوالہ کر دی ہیں وہ لوگ خود بھی امریکی جاسوسی خانہ کی اسناد کے ترجمہ میں لگے ہوئے ہیں اور انشاء اللہ انہیں دنوں میں کسی نتیجہ تک پہنچ جائیں گے'۔

انہوں نے بڑی مایوسی کے ساتھ دور بین ہٹائی، پیشانی پر شکنیں پڑ گئی تھیں۔

'کیا ہوا'؟ میں نے پوچھا۔

انہوں نے جواب دیا'خود ہی دیکھ لو، اس گردوخاک کی ایک وجہ یہ ہے کہ عراق اپنی سرحد کی طرف مورچے تعمیر کر رہا ہے'۔

میں نے دور بین آنکھوں سے لگائی تو واقعاً وہ صحیح کہہ رہے تھے، سرحد پر عراق کی سرگرمیاں حد سے بڑھ چکی تھیں۔

'جیسے حملہ یقینی ہے'۔

'لگ تو ایسا ہی رہا ہے، ہمیں بھی سرحدی محافظوں کی تعداد بڑھا دینی چاہئے'۔

'خوزستان انقلاب محافظ فوج کے کمانڈر سرحد پر کئی جگہ چوکیاں تعمیر کر رہے ہیں لیکن اتنا کافی نہیں ہے'۔

'ہمارے پاس تو وسائل بھی نہیں ہیں۔ تھوڑے بہت اور ہلکے پھلکے ہتھیاروں سے کیا ہو جائے گا؟ عراق کی اسلحوں لیس افواج کا جی تھری، ایم ون اور گرینیڈ سے کیونکر مقابلہ کیا جاسکتا ہے'؟

میرا اندازہ ہے اس کے ٹھیک ایک ماہ بعد جنگ شروع ہوئی تھی۔ اگلے دنوں میں خرم شہر کی سرحد پر دشمن کی سرگرمیاں اور بڑھ گئیں اور کئی جگہوں پر فائرنگ کی جانے لگی۔ اس کے بعد ۲۲ ستمبر کو باقاعدہ جنگ شروع ہوگئی۔ عراقی بہت جلد خرم شہر کی سرحد عبور کرنے میں کامیاب ہو گئے اور پیش قدمی کرتے گئے اور اب اہواز بھی ان کے مارٹر شلوں کی زد میں آیا چاہتا تھا۔

ہم سب کی زندگی کے تلخ ترین ایام شروع ہو چکے تھے۔ حسین اور ان کے ساتھیوں نے جس انقلاب کے لئے اتنی مشقتیں اٹھائی تھیں ابھی اس کی کامیابی کی خوشیاں بھی پوری طرح نہیں منا پائے تھے کہ ہمیں اتنی بڑی جنگ کی آگ میں جھونک دیا گیا۔ لیکن مقابلہ کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا تاہم ابھی

کوئی باقاعدہ منصوبہ بندی نہیں کی گئی تھی۔ حسین ان دنوں لگاتار انقلاب محافظ فوج کی اعلیٰ کمان کے دفتر جاتے اور پتہ لگانے کی کوشش کرتے کہ جہان آراء اور ان کے ساتھی دشمن کو روکنے کے لئے کیا منصوبہ بندی کر رہے ہیں۔ ہویزہ یونٹ کے کمانڈر اصغر گندمکار بری بری خبریں لایا کرتے تھے۔

'عراقی تیزی سے آگے بڑھ رہے ہیں، ان کے ٹینک بستان تک آ پہنچے ہیں۔ سب کچھ تباہ کرتے آگے بڑھے جا رہے ہیں۔ اگر انہیں روکا نہ گیا تو بہت جلد سوسنگرد اور اہواز بھی ہمارے ہاتھ سے نکل جائے گا'۔

'ہمارے پاس عوامی ملیشیا ہے لیکن اسلحہ نہیں'۔

'جتنا اسلحہ ہی اسی کے ذریعہ کچھ رضاکاروں کو تربیت دی جائے'۔

حسین کی مدد سے کچھ لوگ خرم شہر روانہ ہو گئے اور تقریباً ان سب کو پتہ تھا کہ واپس نہیں آ پائیں گے اس کے باوجود بصد شوق روانہ ہوئے۔ ان دنوں ہم اسلحہ کے لئے در در کی ٹھوکریں کھا رہے تھے اور حسین نے سارے حربے آزما لئے۔ کچھ عرصہ سے اہواز کے گرد خندق کھودنے کا کام جاری تھا لیکن

اس سے بہت زیادہ امیدیں نہیں تھیں۔اُس وقت ڈاکٹر چمران امور جنگ میں امام خمینیؒ کے خصوصی نبارودی سرنگ دہ تھے۔ حسین برابر ان سے رابطہ میں رہتے تھے تاکہ ان سے جہاد کی مہارت بھی سیکھیں اور دفاع کے مقدمات بھی فراہم کریں۔اہواز میں مزاحمت منطقی نہیں لگ رہی تھی اس لئے کہ اگر دشمن اہواز کے اطراف تک آنا چاہتا ہے تو شہر اس کے نشانہ پر ہو گا اور ہم کچھ بھی نہیں کرپائیں گے۔

حسین اور ڈاکٹر چمران کے درمیان گفتگو کے دوران طے پایا کہ دفاعی لائن اہواز کے باہر دب حردان اور حمیدیہ نامی علاقوں کو قرار دیا جائے۔ ہمارے لگ بھگ سو مجاہدین حمیدیہ سے اہواز جانے والے سڑک پر مورچہ زن ہوں اور گرینیڈ اور مولوتوف کوکٹیل وغیرہ سے دشمن کو آگے بڑھنے سے روکیں۔

پروگرام کے مطابق ہم سڑک پر جگہ جگہ مورچہ زن ہو گئے۔ ہر آدمی اپنے لئے ایک لومڑ گڑھا کھود کر دشمن کا انتظار کرنے لگا۔رضا پیرزادہ، اصغر

گندمکار اور معمارزادہ بلکہ جزائری مسجد کے اکثر ساتھی ہماری پشت پناہی کر رہے تھے۔

ایک دن غروب کے وقت ہم اہواز سے نکلے اور سڑک پر ڈٹ گئے۔اس وقت حمیدیہ سوسنگرد روڈ پر دشمن کے ٹینک موجود تھے۔عراقی میسان صوبہ کے بعد واقع چذابہ نامی سرحدی علاقہ عبور کرکے ریت کے ٹیلوں سے گذرتے ہوئے بستان اور ہویزہ میں داخل ہو چکے تھے اور سوسنگرد کا مکمل محاصرہ کیاچاہتے تھے۔

ابھی بھی بنی صدر عوامی ملیشیا کو ہتھیار دینے سے کترارہا تھا لیکن عراقی کافی آگے بڑھ آئے تھے اور خامنہ ای صاحب کی کوششوں سے، جو کہ اس وقت اعلیٰ دفاعی کونسل میں امام خمینیؒ کے نمائندے تھے، فوج، انقلاب محافظ فوج کی ضرورت کا کچھ جنگی سازوسامان ہمیں دینے پر تیار ہوئی۔اس دن حسین بہت خوش تھے اس لئے کہ ان کی کئی ہفتوں کی کوششیں رنگ لائی

تھیں۔اس کے بعد آئی، آر، جی، سی[1] خوزستان یونٹ کے آپریشن کمانڈر برادر غیور اصلی نے بڑی مشکل سے کچھ آر، پی جیز حاصل کیں اور انہیں مجاہدین میں تقسیم کر دیا۔ موسم خزاں آچکا تھا لیکن ابھی بھی گرمیوں کی سی گرمی تھی۔ ہم نے گاڑیوں کی لائٹیں آف کرر کھی تھیں۔جب منزل پر پہنچے تو غیور نے کہا 'اب کوئی نہ بولے اور نہ کسی کی آواز آئے'۔

ہم نے آر، پی جیز اور میزائل بیگ اٹھائے اور سوسنگرد روڈ کی طرف چل پڑے۔وہ رات اور اس کے واقعات کبھی نہ بھولیں گے، وہ ہمارا سب سے پہلا گوریلا آپریشن تھا۔ آج جب مدتوں کے انتظار کے بعد آپریشن کا موقع ملا تھا تو ہم خوشی سے پھولے نہیں سمارہے تھے۔بس ابھی آر، پی، جی اور کلاشنکوف کی آوازیں صحرا کی خاموشی توڑ دیں گی اور لوگوں کو بھی پتہ چل جائے گا کہ کوئی ہے جو دشمن کا مقابلہ کر رہاہے۔جو لوگ بوریا بستر باندھ کر گاڑی اور پیٹرول کا انتظام کرنے میں کامیاب ہو چکے ہیں اور بھیگی پلکوں سے اپنے گھروں کو

---

[1] Islamic Revolution Guards Corps. یا وہی سپاہ پاسداران انقلاب جس کا ترجمہ ہم نے انقلاب محافظ فوج کے بطور کیا ہے۔

خیر باد کہہ رہے ہیں شاید ایک لمحہ کے لئے وہاں تک واپس آ جائیں جہاں سے انہیں ہماری فائرنگ کی آواز سنائی دے اور میزائل پھٹنے اور دشمن کے ٹینک اڑنے کا منظر دکھائی دے تو ان کا دکھ بھی کم ہو اور واپسی کی امید ی بڑھ جائیں۔

بہر حال ہم نے اپنی اپنی پوزیشنیں سنبھال لیں۔ان جذباتی لمحات میں میرا بہت دل چاہ رہا تھا کہ میں حسین کے ساتھ رہوں۔ آہستہ سے عباس سے پوچھا ،تمہیں حسین نظر نہیں آئے'؟ بولا 'نہیں'۔

عباس اور میں ساتھ تھے۔ ہم نے زیادہ تربیت نہیں لی تھی، میزائل بھی اتنے زیادہ نہیں تھے کہ ہر کوئی کئی عدد داغ سکے۔ ہمیں زیادہ تر خالی پائپ کی تربیت دی گئی تھی۔ خالی پائپ تو آپ جانتے ہوں گے نا؟ یہ آر، پی، جی میزائل ہی کی طرح کی ایک چیز تھی جس کے آگے کلاشنکوف کی گولی لگتی تھی۔خالی پائپ داغتے تھے لیکن حقیقت میں صرف کلاشنکوف کی گولی دغتی تھی۔ مجھے بہت ڈر

لگ رہا تھا کہ کہیں میزائل نشانہ پر نہ لگیں لہٰذا میں نے صرف ایک بار اصل میزائل داغا۔

انتظار کے لمحات تو ہمیشہ ہی سخت ہوتے ہیں۔ عباس نے پوچھا 'ہم شروع کیوں نہیں کر رہے ہیں؟ کس چیز کا انتظار کر رہے ہیں'؟

'پتہ نہیں شاید صبح میں حملہ کا پروگرام ہو'۔

اور مجھے پھر حسین یاد آ گئے۔

'تعجب ہے ان سے ملاقات نہیں ہوئی۔ چلتے وقت میں سخت اضطراب میں تھا اس قدر کہ آس پاس کی کوئی خبر نہیں تھی'۔

'حسین آنا چاہتے تھے کہ انہیں بلا لیا گیا۔ شاید انہیں کسی کام کے لئے روک لیا گیا تھا، شاید ایک اور گروہ ترتیب دینے کا پروگرام ہے'۔

'پتہ نہیں لیکن بعید ہے کہ حسین ایسی رات ہاتھ سے جانے دیں'۔

ہم لوگ ایسے ہی سر گوشیاں کر رہے تھے کہ اچانک دو سائے نزدیک آتے محسوس ہوئے۔جب قریب آئے تو پتہ چلا کہ غیور اور حسین ہیں۔میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا'حسین'!اور وہ دونوں ہمارے پاس بیٹھ گئے۔

'کہاں تھے حسین'؟

'دیر سے پہنچا ہوں،مجھے آنا نہیں تھا لیکن برداشت نہیں کر سکا'۔

'آپریشن کب شروع ہو گا'؟

'بس تھوڑی دیر میں۔ٹینک سڑک پر ہیں لگتا ہے اچھا شکار ہاتھ آئے گا'۔

'لیکن ہمیں تو ابھی کچھ دکھائی نہیں دیا'۔

'یہاں سے دکھائی نہیں دیتا، ہمیں آگے جانا ہو گا، احتیاطاً یہاں رکے ہوئے تھے لیکن اب آگے چلیں گے۔خیال رکھئے گا میزائل ضائع نہ ہوں، یوں سمجھئے کہ آپ کو ہر میزائل ایک ٹینک اڑانے کے لئے دیا گیا ہے۔خدا پر بھروسہ رکھئے'۔

وہ جھکے جھکے ہم سے دور ہوئے اور دیگر ساتھیوں کے پاس چلے گئے۔

'عباس! دیکھا میں کہہ رہا تھا نا کہ حسین سے صبر نہیں ہو گا'۔

'ہاں! مجھے نہیں پتہ تھا'۔

صبح تڑکے ہم سڑک کے نزدیک پہنچے، اتنا نزدیک کہ ٹینک دکھائی دینے لگے۔ دشمن کو ہماری آمد کا احساس نہیں ہوا تھا۔ سب نے پوزیشنیں سنبھالیں اور پھر کھمبے کے پاس سے پہلی گولی چلی اور ایک ٹینک کو جا لگی۔ اس کے بعد گولیوں اور دھماکوں کی آوازیں ایک دوسرے میں گھل مل گئی تھیں۔ عراقی اس اچانک حملہ سے بوکھلا گئے اور جواباً کیلیبر ۵۰، مارٹر ۶۰ اور ٹینک سے فائرنگ کرنے لگے۔

میں نے جب پہلی گولی چلائی تو میرا کان پھٹا جا رہا تھا۔ مجھے منہ کھلا رکھنا یاد نہیں رہا تھا۔

سو میٹر کے فاصلہ سے میں ایک ٹینک کو اڑانے میں کامیاب ہو گیا۔ عباس چلا رہا تھا اور کچھ کہہ رہا تھا، نہیں معلوم تکبیر کہہ رہا تھا یا میرا حوصلہ بڑھا رہا تھا۔ مجھے

بس اس کا منہ کھلتا بند ہوتا نظر آیا، آواز نہیں سنائی دی۔کچھ دیر بعد میری سماعت واپس آئی۔ جہنم کا منظر تھا! عراقیوں پر بن آئی تھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد انہوں نے عقب نشینی اختیار کرنا شروع کر دی، سوسنگرد کی طرف لوٹنے لگے۔میں نے جس ٹینک کو اڑایا تھا اس کی وجہ سے سڑک بند ہو گئی تھی اور اس سے شعلے اٹھ رہے تھے۔ایک ٹینک اسے ہٹانے کی کوشش کر رہا تھا کہ عباس نے ایک میزائل تیار کر کے میری طرف بڑھا دیا۔

'علی مارو! بھاگنے مت دو' اور میں ٹینک کا نشانہ لینے لگا۔

عباس چلایا'مارتے کیوں نہیں؟ دیر کیوں لگا رہے ہو'؟

لیکن میں میزائل ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا اس لئے پورے دھیان سے یہ کام کرنا چاہتا تھا۔ عباس کا سہارا لیا تاکہ بدن نہ لرزے۔اس نے پھر کہا'مارو'!

میں نے فائر تو کیا لیکن میزائل ٹینک کے اوپری حصہ کو چھوتا ہوا نکل گیا۔ایسا منظر میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔

عباس بولا'کیا بدقسمتی ہے'!

اس نے تب ایک اور میزائل لانچر میں لگا کر مجھے دیا لیکن اسے فائر کرنے کے کا موقع نہیں ملا اس لئے کہ قبل اس کے کہ میں فائر کرتا ٹینک نے ہماری طرف گولی چلا دی جس سے ہمارے پیچھے کی جھاڑی کو آگ لگ گئی اور ہم دونوں اچھل کر دوسری طرف جا گرے۔

اچانک سر بھاری محسوس ہونے لگا جیسے بہت زیادہ پھول گیا ہو۔ سر پر ہاتھ پھیرا، کوئی زخم نہیں آیا تھا۔ پلٹ کر عباس کو دیکھا تو زمین پر پڑا ہوا تھا اور آنکھیں ڈھلک گئی تھیں، اس کی حالت مجھ سے زیادہ خراب تھی۔ میں نے اس کے چہرہ اور سر پر تھوڑا پانی چھڑکا اور اس کے بعد اسے گڈھے میں لٹا دیا تاکہ گولی چھرّے سے بچا رہے۔ اس کے بعد میں نے مزید دو میزائل داغے لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا نہ تو کسی ٹینک کو لگے اور نہ سڑک سے گذرنے والی کسی عراقی فوجی گاڑی کو۔

جب مجھے اپنے میزائل ضائع ہوتے دکھائی دیے، چکر اور متلی آنے کی وجہ سے صحیح نشانہ نہیں لے پا رہا تھا تو مجھے یاد آیا کہ میرے پاس کچھ ہینڈ گرینیڈ بھی

ہیں، وہ میں نے بیگ سے نکالے اور سوسنگرد کی طرف بھاگ رہے عراقیوں کی طرف پھینک دیے۔

سورج نکلنے والا تھا۔ میں تھکا ہارا ایک ٹیلے کے عقب میں لیٹ گیا۔ پاس سے کسی کے گذرنے کا احساس ہوا، دیکھا تو حسین تھے۔ کندھے پر اسلحہ اٹھائے بھاگے جا رہے تھے۔ میں چلایا 'حسین! حسین کہاں'؟

لیکن شاید انہوں نے میری آواز نہیں سنی، پتہ نہیں کیا ہوا تھا۔ کچھ دیر بعد ہمارے پاس دو زخمی لائے گئے۔ ہم نے ان سے پوچھا 'آپ لوگوں نے حسین کو نہیں دیکھا؟ سڑک کی طرف بھاگے جا رہے تھے'۔

'وہ غیور کے پاس گئے ہیں'۔

'غیور کو کیا ہوا ہے'؟

'شہید ہو گئے ہیں'۔

اب مجھے پتہ چلا کہ حسین کہاں گئے اور کیوں اس قدر بے خبر تھے کہ انہیں میری آواز نہیں سنائی دی۔

اس رات کے آپریشن کا فائدہ یہ ہوا کہ عراقی بستان تک عقب نشینی کر گئے۔سب ساتھیوں کے حوصلے بلند تھے۔ حسین کہنے لگے ٫ہمیں ایسے حملے جاری رکھنا ہوں گے تا کہ دشمن آرام سے نہ بیٹھ سکے٬۔

اس وقت دب حردان میں نصب عراقی مارٹر آسانی سے اہواز کو نشانہ بنا سکتے تھے۔شروع میں ہمیں کچھ آوازیں آتی تھیں تو ہم سوچتے تھے کہ توپ کا فائر ہمارے سر سے گذر رہا ہے لیکن بعد میں پتہ چلا کہ یہ ایک سو بیس مارٹر شلوں کی آواز ہے جو شہر کے مختلف علاقوں پر برس رہے ہیں۔صورتحال بہت تشویشناک تھی۔لوگ گروہ در گروہ شہر کو الوداع کہہ رہے تھے۔چمران صاحب کے گوریلے جگہ جگہ حملے کرتے لیکن ان سے دشمن کو بھاری نقصان تو ہوتا لیکن اسے عقب نشینی پر مجبور نہ کر سکے۔ان دنوں اعلیٰ دفاعی کونسل میں امام خمینیؒ کے نمائندے سرنگ دہ خامنہ ای صاحب بھی ڈاکٹر چمران کے کے

پاس تھے۔ حسین کسی بھی طرح دشمن کو کھدیڑنا چاہتے تھے لیکن براہ راست مقابلہ اور سامنے سے حملہ کا کوئی فائدہ نہیں ہو رہا تھا۔

'اگر ہمیں سیدھے ان کی طرف جائیں تو مجاہدین کا قتل عام ہو جائے گا'۔

'تو کیا کریں'؟

'ان پر اچانک حملہ کی ضرورت ہے'۔

'کیسے'؟

'اس طرف سے ان پر حملہ کیا جائے جس طرف سے وہ سوچ بھی نہیں سکتے'۔

'یعنی کس طرف سے'؟

'دریائے کرخہ کے مغرب سے'۔

'لیکن یہ بہت مشکل کام ہے'۔

'مجھے یقین ہے کہ مجاہدین اس میں کامیاب ہو جائیں گے، علاقہ کی شناخت کی جا چکی ہے'۔

'یعنی بس ڈاکٹر چمران اور خامنہ ای صاحب کی اجازت کی ضرورت ہے'۔

'وہ میرے ذمہ'۔

حسین اپنا منصوبہ پیش کرنے گوریلا جنگ کے دفتر کی طرف روانہ ہو گئے۔ جب لوٹے تو خوش تھے۔

'کیا ہوا'؟

'مان گئے ہیں'۔

'اب یہ کام کریں کیسے'؟

'ہمیں حمیدیہ کی طرف سے نہر کے کنارہ کنارہ آگے بڑھنا ہو گا اور دب حردان پہنچ کر پانی سے گذرنا ہو گا'۔

'ہماری تعداد کتنی ہے'؟

'پچاس سے اوپر'۔

'کب شروع کریں گے'۔

'آج ہی اور ان شاء اللہ رات میں ہم عراقی ٹینکوں پر ٹوٹ پڑیں گے'۔

ہم نے جلدی جلدی ذمہ داریاں تقسیم کیں۔ مجھے ایک سوچھ جیپ کے ذریعہ اپنی ذمہ داری نبھانی تھی۔ اب جیپ کو نہر سے گذارا نہیں جا سکتا تھا لہٰذا ہم نے اس کے لئے کنارہ پر ایک جگہ بنائی اور طے پایا کہ میں اور میرے ساتھ وہیں رکے رہیں گے جب باقی مجاہدین نہر عبور کر کے اپنا کام شروع کریں گے تو ہم بیک سے ان کی سپورٹ کریں گے۔

اس دن حسین ایک عام سپاہی کی طرح ہمارے ساتھ تھے۔ راستے میں کھنڈرات میں تبدیل ہو چکے گاؤں آئے، کبھی کبھی مارٹر شل سنسناتے ہوئے ہمارے پاس آ گرتے اور ہم جہاں ہوتے وہیں لیٹ جاتے۔ ایک دو بار روشنی رونده بھی داغے گئے لیکن ان کا فاصلہ ہم سے زیادہ تاہم جب روشنی رونده داغا جاتا تو صحرا میں دن کے جیسی روشنی ہو جاتی۔ پہلے آ کر علاقہ کی چھان بین

کرنے والے مجاہدین نے بڑی زحمات سے پانی سے گذرنے کے کے لئے کیبل بھی لگایا تھااور یہ بھی پتہ کیا تھا کہ دشمن کے ٹینک درست کس جگہ ہیں۔

حسین اور ان کے ساتھ سب سے پہلے پانی سے گذرے۔

'حسین آپ کس گروہ کے ساتھ ہیں'؟

'محمد کاظمی کے'۔

کیبل ہاتھوں سے تھامی اور نہر عبور کر گئے۔ جب سب اس پار چلے گئے اور ہم تنہا ہو گئے تو میں نے بیلچہ سے جیپ کے ٹائر صاف کئے۔ فائر کرنے کے لئے ہمیں گاڑی اسٹارٹ کرنا اور تھوڑا آگے بڑھانا تھی لیکن میں ڈر رہا تھا کہ کہیں ہم دیکھ نہ لئے جائیں۔ اس لئے میں نے کہا کہ جب حملہ شروع ہو گا تب کریں گے۔ پہلے ٹینک سے ہم پانچ سو میٹر سے کم کے فاصلہ پر تھے اور اس کا سایہ کسی آلہ کے بغیر بھی دکھائی دے رہا تھا۔ چاند نہیں نکلا تھا لیکن تب بھی زیادہ اندھیرا نہیں تھا۔ گولے ہم نے وہیں نزدیک اکٹھے کر رکھے تھے، دس پندرہ پیٹیوں سے زیادہ گولے نہیں لا پائے تھے۔ میرا کام فائر کرنا تھا اور دو مجاہدین

میرا ساتھ دے رہے تھے۔ جب پہلا آر، پی، جی کا گولہ داغا گیا تو میں نے کے، ایم اسٹارٹ کی اور اسے اس کے لئے بنائی گئی مخصوص جگہ تک پہنچایا۔ 'خدایا تیرا ہی آسرا' کہہ کر میں نے ایک ٹینک کا نشانہ لیا اور فائر کر دیا۔ جب گولہ نشانہ پر لگا تو میری باچھیں کھل گئیں۔اب نہر کے اس طرف آگ ہی آگ نظر آرہی تھی۔ٹینک، فوجی گاڑیاں کوئی یہاں، کوئی وہاں، بس جلی جارہی تھیں۔فائرنگ کی آواز لمحہ بھر کے لئے بھی رک نہیں رہی تھی۔ کبھی کبھی مجھے گولہ پھٹنے سے پیدا ہونے والی روشنی میں کوئی مجاہد فائر کرتا، گرینیڈ پھینکتا یا ٹینک پر چڑھتا نظر آتا اور میں یہ منظر دیکھنے میں اس قدر محو ہو گیا تھا کہ ایک لمحہ کے لئے سب کچھ بھول گیا۔

'رکے کیوں ہیں؟ خالی کارٹریج نکال کر دیجیئے'!

ساتھی کی آواز سن کر چونکا۔

گولے ختم ہو گئے تھے۔ تین چار ٹینکوں میں آگ لگی تھی اور عراقی بھاگے جا رہے تھے۔اب نہر کے اس طرف رہنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میں نے کلاشنکوف اٹھائی اور کہا'میں اس طرف جا رہا ہوں'۔

پانی میں کودا اور کیبل پکڑے پکڑے آگے بڑھنے لگا۔مجھے ساتھی مجاہدین کی فکر تھی اور سب سے زیادہ حسین کی۔وہ اسی وقت سے ہم سب کے چہیتے تھے۔ہر مشکل انہیں کے ذریعہ حل ہوتی تھی۔چاہے وہ آپریشن کی منصوبہ بندی ہو یا مجاہدین کی صفیں منظم کرنا ہوں ہر جگہ ان کا مرکزی کردار ہوتا تھا۔ہاں میں یہ بتانا بھول گیا کہ ان دنوں ملک کے جنوبی محاذوں کے لئے سپاہیوں کا تعین بھی حسین کے ذمہ تھا۔ملک کے کونہ کونہ سے رضاکار اہواز پہنچ رہے تھے، آپ ان کا خندہ پیشانی سے استقبال کرتے، انہیں خوش آمدید کہتے اور ان کی پذیرائی کرتے ۔ ان لوگوں کو اہواز کے پروین اعتصامی کالج میں ٹھہرایا جاتا تھا۔ حسین، آیت اللہ خامنہ ای،ڈاکٹر چمران اور انقلاب محافظ فوج کے اعلیٰ عہدیداران کی میٹنگوں میں شریک ہوتے اور پتہ کرتے کہ کس علاقہ کو کتنے سپاہیوں کی ضرورت ہے۔لہٰذا جب مختلف جگہوں سے رضاکار

آتے تو ان کی ذمہ داریاں متعین کرنا اور انہیں محاذ پر روانہ کرنا اپنے ذمہ لے رکھا تھا۔اس وجہ سے بہت سے برادران نہیں چاہتے تھے کہ آپ کسی آپریشن میں شرکت کریں اور کہتے تھے 'تم اہواز میں ہی رہو، یہاں تمہاری زیادہ ضرورت ہے'۔

لیکن آپ کوئی آپریشن چھوڑ دیں یہ نہیں ہو سکتا تھا۔

بہر حال اس رات جب میں نہر کے اس پار پہنچا تو مجھے بس حسین کی تلاش تھی۔دو مجاہد زخمی تھے، ایک کے پہلو میں تیر لگا تھا دوسرا اسے طبی امداد فراہم کر رہا تھا۔میں اس کی مدد کے لئے پاس بیٹھا تو دیکھا اس کا رومال پوری طرح بھیگا ہوا ہے۔

'آپ نے حسین علم الہدیٰ کو نہیں دیکھا'؟

'نہیں وہ ہم سے آگے تھے'۔

میں ان کے پاس سے اٹھا اور آگے بڑھنے لگا۔ٹینک ابھی بھی جل رہے تھے۔اور اب گولے اور شل ایک ایک کرکے پھٹ رہے تھے اور میرے

کان کے پاس سے گذر رہے تھے۔ لگتا تھا عراقیوں کو اب ہم پر مارٹر فائر کرنے کا موقع ملا ہے۔ کچھ دیر کے لئے فائرنگ اتنی بڑھ گئی کہ ہم کچھ بھی کرنے سے قاصر تھے۔ نہر کے اس طرف کا بھی یہی حال تھا۔ جب فائر بند ہوا تو میں پھر سے حسین کی تلاش میں نکل پڑا اور آخر انہیں پا ہی لیا۔ تھکے ہوئے تھے لیکن خوش تھے۔ مجھے دیکھ کر کہنے لگے 'علی کیا ہوا؟ گاڑی کہاں چھوڑ آئے ہو'؟

'کچھ نہیں ہوا۔ ہمارے پاس سے بارود ختم ہو گیا اور آپ کی فکر ہونے لگی'۔

'نہیں، ابھی جلدی ہے'۔ جواب میں سنجیدگی اور مذاق دونوں تھے۔

میں نے دیکھا کہ سوسنگرد کی سڑک کو دیکھے جا رہے ہیں۔ شاید کچھ کرنے کا سوچ رہے تھے۔ میں نے کہا 'رات ٹھیک رہی'۔

'اتنا کافی نہیں ہے۔ ہمیں مزید یہاں رہنا ہو گا۔ اگر ہم اس طرح کے حملے جاری رکھ سکیں تو دشمن کو سکون سے بیٹھنا نصیب نہیں ہو گا۔ مجھے یہاں رہنا چاہئے۔ سوچ رہا ہوں عنقریب مجھے سپاہی، محاذ پر روانہ کرنے کی ذمہ داری کسی اور کو سونپنا پڑے گی'۔

اور پھر انہوں نے وہی کیا جو کہہ رہے تھے۔

ہم نے ایک کیمپ میں ڈیرا ڈالا اور ہر رات دشمن کی دفاعی لائن کے عقب سے اس پر حملہ کرتے۔ خطرناک اور طولانی راستے طے کرتے اور عراقی ٹینکوں اور بڑی گاڑیوں کے راستہ میں بارودی سرنگ بچھا دیتے۔ وہ خوفناک راتیں کبھی نہیں بھولیں گی۔ ان کی تفصیل میں آگے چل کر بیان کروں گا۔ ابھی جب یہ سطور لکھ رہا ہوں گویا حسین اپنی اسی مسکراہٹ اور نورانی چہرہ کے ساتھ میری آنکھوں میں سمٹ آئے ہیں۔ ہلکا پھلکا چھریرا بدن اور تیس کیلو کا بوجھ کندھے پر مگر کیا مجال ہے کہ پیشانی پر شکن تک آجائے۔ جب دیکھا کہ ہماری طاقت جواب دے گئی ہے تو مسکرا کے بولے 'اس جھاڑی کے پیچھے بیٹھ کر تھوڑا تازہ دم ہو لیتے ہیں۔ مجھے نہیں لگتا ہم دس کلو میٹر سے زیادہ چلے ہوں گے'۔

ہم نے کندھوں سے بوجھ اتارا اور بیٹھ گئے، پسینہ ایسا جیسے نہا کر نکلے ہوں۔ حسین کہنے لگے 'لگتا ہے ابھی ہمارے جسم پوری طرح تیار نہیں ہوئے ہیں۔ صبح کی دوڑ کا دورانیہ بڑھانا چاہئے'۔

اب جب میں سوچتا ہوں تو اس نتیجہ تک پہنچتا ہوں کہ حسین کو جسم اور روح کی وہ شناخت حاصل ہو چکی تھی جس کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ مثلاً صبح میں ہم جب دوڑنا شروع کرتے تو وہ دور ایک جگہ دکھاتے کہ 'وہاں تک جائیں گے اور پانچ چکر لگائیں گے اس کے بعد باقی ورزش شروع کریں گے'۔

ہم انہیں ایسے دیکھتے کہ جیسے انہوں نے کوئی ناممکن کام بتا دیا ہو۔

'حسین! کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ ایک ہی مرتبہ میں سب کی سانس پھول جائے گی، پانچ چکر تو دور کی بات ہے'۔

'اگر ارادہ کر لو تو ممکن ہے'۔

اور خود سب سے آگے چل پڑتے اور ہم دیکھتے کہ ہاں واقعاً اس قدر دوڑا جا سکتا ہے۔

حملوں کا سلسلہ اسی طرح جاری رہا یہاں تک کہ دشمن نے سوسنگرد کے گرد حصار مزید تنگ کر دیا۔ انقلاب محافظ فوج کی ہویزہ یونٹ تمامتر وسائل کے ساتھ محاصرہ توڑنے سوسنگرد روانہ ہو گئی۔ بہت ہی مشقت کی ضرورت تھی،

اس کی بغیر کوئی چارہ نہیں تھا۔ اگر عراقی سوسنگرد اور ہویزہ پر قبضہ کر لیتے تو آسانی سے شوش اور دزفول کی طرف چلے جاتے اور اہواز کا شمالی راستہ بھی بند کر دیتے۔ اس طرح پورا صوبہ مفلوج ہو کر رہ جاتا۔

عراقی فوج کی بارہ کمپنیوں نے ایران پر حملہ کیا تھا، پانچویں کمپنی سوسنگرد میں خیمہ زن تھی جس کے پاس نہ اسلحوں کوئی کمی تھی اور نہ دیگر جنگی سازوسامان کہ بلکہ پوری طرح لیس تھی لہٰذا سولہ نومبر ۱۹۸۰ کو سوسنگرد کا محاصرہ توڑنا انقلاب محافظ فوج کے جوانوں کا واقعاً بہت بڑا کارنامہ تھا جس میں ہویزہ یونٹ کے کمانڈر برادر اصغر گندمکار بھی شہید ہو گئے۔ ہمیں ابھی خبر نہیں ملی تھی لیکن حسین کو جیسے کچھ الہام ہو گیا تھا۔

'میں اصغر کے پاس جانا چاہتا ہوں'۔

'کوئی کام ہے ان سے'؟

'نہیں'۔

'تو پھر کیوں انہیں ڈھونڈھ رہے ہو'؟

'مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ وہ شہید ہو گئے ہیں'۔

'تمہیں کیسے معلوم؟ کوئی خبر تو آئی نہیں۔ ہویزہ کے بہت سے مجاہد شہید ہو گئے ہیں لیکن ابھی ان کے ناموں کا اعلان تو نہیں ہوا نا'۔

وہ کسی سوچ میں گم تھے اور میری آواز شاید سنی ہی نہیں۔ جب میں نے ان کا یہ حال دیکھا تو کہا 'ٹھیک ہے میں گاڑی اسٹارٹ کر رہا ہوں'۔

کچھ نہیں بولے۔ میں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور ان کے سامنے لے آیا۔ وہ سوار ہو گئے اور ہم سوسنگرد کی طرف چل پڑے۔ علاقہ پر ابھی بھی دشمن کی طرف سے اکا دکا مارٹر شل فائر ہو رہے تھے۔ انہیں اگرچہ عقب نشینی اختیار کرنا پڑی تھی لیکن ابھی بھی شہر اور اطراف کے علاقوں کو نشانہ بنا رہے تھے۔

سوسنگرد سے حمیدیہ جانے والی سڑک بہت مصروف تھی۔ گاڑیاں مستقل یا زخمیوں کو لا رہی تھیں یا جنگی ساز و سامان لے جا رہی تھیں۔ دشمن جس جگہ راستہ بند کر کے اطراف کے علاقوں سے سوسنگرد کا رابطہ پوری طرح منقطع کرنا چاہتا تھا وہاں بہت سے تباہ شدہ ٹینک اور فوجی گاڑیاں دکھائی دیں۔ واضح

تھا کہ اس مقام پر سخت جھڑپ ہوئی ہے۔ایک مارٹر شل سیدھا گاڑی کے سامنے آلگا۔میں نے اسٹیرنگ اتنی تیزی سے گھمائی کہ گاڑی الٹتے الٹتے بچی۔میزائل کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہمارے آس پاس سے گذر گئے، ایک دو گاڑی کے سامنے بھی لگے لیکن کوئی نقصان نہیں ہوا۔

آخر کار ہم سوسنگرد پہنچ گئے۔شہر پوری طرح جنگ زدہ لگ رہا تھا۔ہر طرف نیم تباہ شدہ گھر اور منہدم شدہ گاڑیاں نظر آرہی تھیں اور سڑکیں قبرستان کا منظر پیش کر رہی تھیں۔جیسے سول گاڑیوں کے لئے بنی ہی نہ ہوں بس فوجی گاڑیاں سنسناتی گذرتیں اور ان پر تھکے ماندے فوجی سوار ہوتے۔وقفہ وقفہ سے رہائشی گھروں یا سڑک پر مارٹر شل گرتے اوروہاں کچھ دیر کے لئے دھویں کے بادل چھا جاتے۔شہر کی حالت ناگفتہ بہ تھی اور انقلاب محافظ فوج کے جوانوں کو کچھ پتہ بھی نہیں چل پا رہا تھا۔حسین بولے ’ہویزہ چلتے ہیں، یہاں کی حالت بہت خراب ہے‘۔

عراقیوں نے مغرب کی طرف سے سوسنگرد پر دھاوا بول رکھا تھا تاہم وہ جوں جوں شہر سے نزدیک ہوتے گئے فائرنگ کم ہوتی گئی۔

ہویزہ پہنچ کر ہم سیدھے انقلاب محافظ فوج کے دفتر پہنچے۔ وہاں کچھ آشنا جوان نظر آئے، مضطرب اور پریشاں حال۔ لگ نہیں رہا تھا کہ ان کے پاس مقابلہ کے لئے کوئی خاص منصوبہ ہے۔ یہ وہی جوان تھے جو سوسنگرد کی لڑائی میں بچ گئے تھے۔ ایک سے میں نے پوچھا 'کیا ہو رہا ہے یہاں پہ؟ برادر گندمکار کہاں ہیں'؟ ایک تیکھی نظر اٹھی اور جواب ملا 'چلے گئے'۔

'چلے گئے؟ کہاں گئے'؟

جواب فقط تیکھی نگاہیں تھیں۔ شاید میرا سوال بھی بے جا تھا۔ میں نے حسین کی طرف دیکھا، پتہ نہیں کیسے سمجھ گئے تھے کہ برادر گندمکار شہید ہو چکے ہیں۔

گندمکار صاحب کی شہادت سے ہماری فوج کی ہویزہ یونٹ کا ناقابل تلافی نقصان ہوا۔ ایسا شخص ہمیں چھوڑ کے جا چکا تھا جس کا خلوص، کمانداری،

عسکریت اور سب سے بڑھ کر خلاقیت نایاب یا کمیاب تھی۔ اس خلاء کا جلد پر ہونا ناممکن لگ رہا تھا اور ہویزہ یونٹ بھی عملاً مفلوج ہو گئی تھی۔

'اور کون شہید ہوا ہے'؟

'بہت سے، اکبر پیرویان، رضا پیر زادہ۔۔۔'۔

اکبر صاحب ہویزہ میں تعینات کازرونی یونٹ کے کمانڈر تھے اور رضا صاحب ہویزہ یونٹ کی انٹیلیجنس ونگ کے ہیڈ۔ اب اس یونٹ کی مثال اس عمارت کی ہو چکی تھی جس کے ستون گر چکے ہوں اور قریب الانہدام ہو۔

'کچھ گرفتار بھی ہوئے ہیں'؟

'ہاں'

'کتنے'؟

'ابھی کسی کو کچھ پتہ نہیں'۔

'آپ لوگوں کو کوئی حکم نہیں ملا ہے'؟

'نہیں'

'تو آپ لوگ کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں'؟

'کچھ پتہ نہیں۔ گند مکار صاحب دلوں پر حکمرانی کرتے تھے ان کے جانے سے واقعاً ایک بڑا خلاء پیدا ہو گیا ہے'۔

'جوانوں کو منظم کرنا ہو گا'۔

'کیسے'؟

'اس کی فوری ضرورت ہے۔ گھٹنوں میں سر رکھ کر بیٹھنے کا وقت نہیں ہے'۔

اس دن شہید حکیم، قدوسی، شہید غفار درویشی، شہید سید مرعشی اور ہویزہ کے کچھ مقامی جوان بھی وہاں تھے ظاہر اَنیسی اور یونس شریفی وغیرہ تھے۔

اس دن حسین کی حالت عجیب تھی۔ ایک طرف گند مکار اور ان کے ساتھیوں کی شہادت پر رشک کئے جا رہے تھے 'خوش نصیب ہیں! اس منزل پر پہنچ گئے

جہاں پہنچنا اس قدر آسان نہیں ہے'۔ اور دوسری طرف سوچ جا رہے تھے کہ اب کیا ہو گا؟

'ہمیں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیئے، چلو چل کے اہواز سے آرڈر لیتے ہیں'۔

'کب'؟

'ابھی فوراً! ہمارے پاس برباد کرنے کے لئے ایک منٹ بھی نہیں ہے'۔

وانٹ کی طرف آگے بڑھے۔ ہویزہ کے ایک دو مقامی جوانوں نے جب گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز سنی تو پوچھنے لگے 'آپ لوگ کہاں جا رہے ہیں'؟

'اہواز'۔

'ہم لوگوں کو سوسنگرد جانا ہے'۔

'آپ لوگ بھی آجایئے، راستہ میں اتر جایئے گا'۔

یہ لوگ ہویزہ ہی کے رہنے والے تھے۔وانٹ کے پیچھے سوار ہو گئے۔ حسین نے بہت کہا کہ آگے بیٹھ جائیں وہ پیچھے بیٹھ لیں گے لیکن نہیں مانے۔کہنے لگے 'ہم لوگ ساتھ بیٹھیں گے، گپیں لگائیں گے'۔

حسین بولے 'اچھا! خدا آپ لوگوں کا بھلا کرے تو پھر کوئی ایک آگے آکر ہمیں بھی فیضیاب کرے'۔

اس برادر کا نام رحیم تھا۔ آگے آکر بیٹھ گیا۔ حسین نے اس سے پوچھا 'آپ لوگ کہاں جارہے ہیں'؟

'شط علی گاؤں'۔

'سوسنگرد کے پاس'؟

'جی'۔

'کیوں'؟

وہاں کچھ آئی، آر، جی، سی کے جوان ہیں جو براہ راست اہواز کے زیر نگرانی کام کرتے ہیں، ایک چوکی بھی ہے ان کی۔ وہاں جا کر دیکھتے ہیں شاید ہم سے بھی کچھ بن پڑے۔ عراقیوں کا اُس طرف کافی زور ہے'۔

'ہم لوگ یہاں کی صورتحال بیان کرنے اہواز جا رہے ہیں۔ انشاء اللہ بہت جلد پھر اکٹھے ہوں گے اور سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا'۔

'اگر ایسا ہوا تو ہمیں بھی بتایئے گا'۔

ہماری گاڑی ہویزہ کی اصلی شاہراہ پر تیز دوڑ رہی تھی کہ اچانک ایک گاڑی نے ہمارا راستہ روکا۔ حادثہ ہوتے ہوتے بچا۔ میں نے بریک لگائی، اس گاڑی کے ڈرائیور نے بھی بریک لگائی۔ ان لوگوں نے گاڑی کے عقب میں کچھ سامان بھی لاد رکھا تھا جس پر ایک چادر پڑی تھی۔ میں نے ڈرائیور کا چہرہ بغور دیکھا اور اس کے بعد گاڑی سے اتر آیا۔

'بہت تیز چل رہے ہیں آپ'!

'آپ بھی ویسے ہی چل رہے ہیں'!

ڈرائیور کے بغل میں بیٹھا شخص اترا اور مسکراتا ہوا ہماری طرف بڑھا۔

'خدا کا شکر کچھ نہیں ہوا'۔

حسین اس شخص کو غور سے دیکھنے لگے، اس نے مقامی لباس پہن رکھا تھا۔ لگ رہا تھا جیسے پاس کے کسی گاؤں کا ہو۔ حسین اور وہ ایک لمحہ کے لئے ایک دوسرے کو بغور دیکھتے رہے۔ اس کے بعد وہ بولا 'بہر حال معافی چاہتا ہوں'۔

میں نے کہا 'تھوڑا احتیاط سے چلئے۔ ایسے کوئی پریشانی کھڑی ہو سکتی ہے'۔

وہ حسین کو دیکھے جا رہا تھا۔ لیکن وہ بولے 'چلو! دیر ہو رہی ہے'۔

ہم چل دیے لیکن وہ آدمی ابھی بھی ہمیں دیکھ رہا تھا، میں نے شیشہ سے دیکھا۔ حسین بھی پلٹ پلٹ کر اسے دیکھ رہے تھے۔ میں نے کہا 'کیا ہوا حاجی صاحب'؟

مذاق میں بولے 'حاجی تم ہو! حاجی ہونا میرے نصیب میں نہیں تھا۔ جانا ہی چاہتا تھا کہ جنگ شروع ہو گئی اور سب درہم برہم ہو گیا۔ بائیس ستمبر کو میری پرواز تھی'۔

'تو اس آدمی کو کیوں گھور رہے تھے آپ'؟

'نہیں معلوم۔ اس کی مسکراہٹ میں کچھ ایسا تھا کہ میں اس کی طرف کھچ گیا۔ اچھا آدمی لگ رہا تھا۔ کون ہے یہ؟ اتنی جلدی کہاں جا رہے تھے وہ لوگ'؟

'میں تو نہیں جانتا بھائی اسے'۔

رحیم بولے 'لیکن میں جانتا ہوں، مشہور آدمی ہے، ادھر بہت سے لوگ اسے جانتے ہیں'۔

حسین بولے 'واقعاً! کیا کرتا ہے یہ آدمی'؟

رحیم مسکرا دیے۔ جیسے جواب دینے سے کترا رہے ہوں۔

'کچھ بول کیوں نہیں رہے'؟

'اصل میں آپ نے ایسی بات کہہ دی ہے کہ میری زبان پر تالا لگ گیا ہے'۔

'ہم نے کیا کہا ہے'؟

'آپ نے کہا کہ آپ کو وہ اچھا آدمی لگا ہے'۔

'ہاں تو اچھا آدمی نہیں ہے کیا'؟

'سچ پوچھیں تو پتہ نہیں۔ باطن کی خبر تو صرف خدا کو ہے لیکن جہاں تک مجھے خبر ہے یہ آدمی اسمگلر ہے'۔

'اسمگلر'؟

'ہاں! سرحد کے اُس پار سے سامان لا کر بیچتا ہے۔ غیر معمولی حد تک چالاک ہے، اس پورے علاقہ کو ہتھیلی کی طرح جانتا ہے۔ کہتے ہیں کہ اگر اس کی آنکھوں پر ٹی باندھ دو تب بھی مٹی کی خوشبو سونگھ کر بتا دے گا کہ کہاں ہے'۔

حسین چہک کر بولے 'اچھا'!

'جی! یہ لوگ اصل راستوں سے نہیں گذرتے ہیں، ادھر اُدھر سے چلتے ہیں۔اسی لئے انہیں ہر جگہ کا پتہ ہوتا ہے۔یہاں آدمی کھوتا بہت جلدی ہے، اگر پانی بھی بھرا ہو تو پھر تو بات ہی الگ ہے۔ہم لوگ بھی ایک بار علاقہ کی شناخت کے لئے آئے تھے کہ نیسان نہر کے پاس کھو گئے۔جانا چاہتے تھے سوسنگرد اور پتہ چلا کہ جارہے ہیں 'ہورالعظیم'۔

'تو یہ آدمی اسمگلر تھا'۔

'اس میں شک کی کیا بات ہے۔البتہ اسے پتہ ہے کہ اسے سب جانتے ہیں لیکن ان حالات میں اس سے کسی کو کوئی مطلب نہیں ہے'۔

حسین کچھ دیر سوچتے رہے، اس کے بعد بولے 'لیکن مجھے یقین ہے کہ میں اسے غلط نہیں سمجھا ہوں۔غلطی کسی سے بھی ہو سکتی ہے لیکن اندر سے یہ آدمی ٹھیک ہے۔شاید ابھی تک اسے نیکی کرنے کا موقع ہی نہ ملا ہو'۔

'ہو سکتا ہے'۔

پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولے 'تمہارا کیا خیال ہے'؟

میں نے کہا 'کیا بتاؤں، میں تو انہیں نہیں جانتا ہوں'۔

اس کے بعد انہوں نے ایک آہ بھری جیسے کچھ یاد آگیا ہو۔ اور کچھ دیر بعد بولے 'افسوس پیر زادہ ہمیں چھوڑ کر چلے گئے۔ اس وقت ہمیں سب سے زیادہ انٹیلیجنس کے ماہر جوانوں کی ضرورت ہے'۔

نہیں معلوم انہیں اچانک شہید پیر زادہ کیوں یاد آ گئے تھے۔ کچھ دنوں کے بعد ہی مجھے اس کا پتہ چل سکا۔۔۔

روڈ پر تقریباً سناٹا تھا۔ اکا دکا کوئی فوجی گاڑی سامنے آتی، اس پر سوار جوان ہماری طرف ہاتھ ہلاتے اور چلی جاتی۔

ہم چلے جا رہے تھے کہ ایک فیملی سڑک کے کنارے کھڑی دکھائی دی۔ گاڑی کا انتظار کر رہے تھے۔ حسین بولے 'رکو دیکھیں ان لوگوں کو کہاں جانا ہے'۔

ہم نے گاڑی روکی، حسین اترے اور ان لوگوں کے پاس جا کر انہیں سلام کیا اور پوچھا 'آپ لوگ کہاں جائیں گے'؟ گاڑھے عربی لہجہ میں خاندان کے مرد کی طرف سے جواب ملا 'نعمہ گاؤں'۔

'بیٹھئے ہم آپ لوگوں کو پہنچا دیں گے'۔

ان لوگوں کے پاس سامان بھی کافی تھا۔وانٹ پر رکھوانے میں بھی حسین نے مدد کی۔

چلنے لگے تو میں نے کہا' ان لوگوں کا گاؤں ہمارے راستہ میں نہیں پڑتا۔انہیں پہنچانے کے لئے ہمیں بہت گھومنا پڑے گا اور وقت بھی کافی چلا جائے گا'۔

'کوئی بات نہیں'۔

'آپ ہی تو کہہ رہے تھے کہ جلدی کرو اور وقت ہاتھ سے مت جانے دو'۔

'یہ سب ہم انہیں لوگوں ہی کے لئے تو کر رہے ہیں۔اب اگر خدمت کا موقع ملا ہے تو اسے ہاتھ کیوں جانے دیں'۔

البتہ میری رائے نہیں تھی۔میں اہواز پہنچنے کو زیادہ اہم سمجھتا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ حسین کو قائل نہیں کر پایا۔آخرکار اس خاندان کو اس گاؤں

پہنچایا۔ بوڑھے شخص نے بہت دعائیں دیں۔ اگر ہم لوگ نہ ہوتے تو شاید رات تک بھی وہ لوگ گھر نہ پہنچ پاتے۔

کچھ دیر بعد ہمارے ہویزہ والے ساتھی بھی اتر گئے۔ جب وہ رخصت ہو رہے تھے تو حسین نے رحیم سے پوچھا 'آپ کہہ رہے تھے کہ آپ اس آدمی کو جانتے ہیں وہ کہاں ملے گا'؟

'بظاہر اس کا تعلق حاج غالب گاؤں سے ہے۔ وہاں آپ جس سے بھی پوچھیں گے حسن کا گھر کہاں ہے بتا دے گا۔ حاجی شبیب کا پوچھ لیجئے گا وہ آپ کی مدد کریں گے'۔

میں نے تعجب سے حسین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا 'آپ کو اس سے کوئی کام ہے کیا'؟

'شاید'

پھر میں نے تفصیل نہیں چاہی کہ کیا اور کیسا کام ہے اور انہوں نے بھی کچھ نہیں کہا۔ نہج البلاغہ کھولی اور مطالعہ کرنے لگے۔ تھوڑا بہت جو وقت مل رہا تھا

اس سے بھی فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ گاڑی گڈھوں میں گرتی پڑتی جارہی تھی، ایسے پڑھنے سے آنکھوں پر زور پڑتا ہے لیکن کیا حسین کو بھی مطالعہ سے روکا جاسکتا تھا؟

وہ حقیقت میں ایک علمی اور ثقافتی شخصیت تھے۔ ایسی شخصیت جس کی فقہی، فلسفی اور تاریخی معلومات پر حیرانگی ہوتی تھی۔ جب وہ علمی گفتگو کرتے تو ہم انگشت بدنداں رہ جاتے اور کہتے کہ اتنی کم عمر میں اتنی معلومت انہوں نے کیسے حاصل کرلی ہیں؟ یقین نہیں آتا تھا۔ یہ بھی طے تھا کہ انہیں ثقافتی کام زیادہ پسند ہیں لیکن انقلاب اور دیگر مشکلات کی وجہ سے دوسرے کاموں میں لگے ہیں۔

اہواز پہنچے تو آپ اپنے پرانے دوستوں سے ملنے گئے اور پھر انقلاب محافظ فوج کی اعلیٰ کمان کو ہویزہ کی صورتحال سے آگاہ کیا۔ اس دن انہوں نے سوچا بھی نہیں ہوگا کہ اعلیٰ کمان ہویزہ یونٹ کی ذمہ داری انہیں کو سونپ دی گی۔ آپ اہواز کی مانی جانی شخصیت تھے، سب ان کی صلاحیتیں جانتے تھے۔ اسی لئے

انہیں ہویزہ کے جوانوں کو اکٹھا اور منظم کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی تھی تاکہ وہاں کی صورتحال میں بہتری آئے جبکہ حسین ایک عام سپاہی کی طرح دشمن سے لڑنا چاہتے تھے۔ مجھے ان کے کندھوں پر نئی ذمہ داری کا بوجھ صاف محسوس ہو رہا تھا۔ ظاہراً اسی دوران ایک دن اہواز میں جب ہم کام سے فارغ ہوئے تو مجھ سے کہنے لگے کہ 'چلو کسی کباب کے ہوٹل پر چلتے ہیں'۔

میں دل ہی دل میں بڑا خوش ہوا۔ کئی دنوں سے ٹھیک سے کھانا نصیب نہیں ہوا تھا۔ ہم ہوٹل کے سامنے جارکے۔ حسین اترے اور کافی سارے کباب لے آئے۔ میں نے سوچا ان کا شاید میرے علاوہ بھی کوئی مہمان ہے اسی لئے اتنا خرچہ کیا ہے۔

'آپ نے اتنے کباب لے لئے ہیں! کس لئے؟ بچ جائیں گے'؟

'گھبراؤ نہیں، نہیں بچیں گے'۔

گاڑی میں بیٹھے اور چل دیے۔ اسٹیرنگ حسین کے ہاتھ میں تھی لہٰذا مجھے یہ سمجھنے میں دیر لگی کہ ہم ان کے گھر نہیں بلکہ کسی دوسرے شہر جارہے

ہیں۔ تعجب ہوا، وہ مجھے کہاں لے جارہے ہیں؟ پتہ چلا ہم اہواز کی ایک غریب بستی میں ہیں۔ وہاں کا نام شاید حصیر آباد تھا۔ ایک گھر کے سامنے انہوں نے گاڑی روکی اور اتر گئے۔

میں نے پوچھا ‘کہاں’؟

انہوں نے جواب دیا ‘ابھی آتا ہوں’ اور ایک روٹی میں ایک دو کباب لپیٹ کر ایک گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ تھوڑی دیر بعد ایک بچہ باہر نکلا۔ حسین نے کہا ‘یہ لیجئے، نذر ہے’۔ کباب دیے اور واپس گاڑی میں آ بیٹھے اور مجھے مولائے کائناتؑ اور آپؑ کی سیرت یاد آگئی اور حسین کی نہج البلاغہ سے الفت بھی۔

اسی طرح آپ نے مزید دو تین گھروں کا دروازہ کھٹکھٹایا اور سب کو ایک ایک دو دو کباب دیے۔ اب ہمارے لئے صرف دو کباب بچے تھے۔ آپ خوشی خوشی گاڑی میں بیٹھے اور بولے ‘چلو! اب گھر چلتے ہیں’۔

آج میں ان کے یہاں مہمان تھا۔ ان کی ماں نے جب ہمیں دیکھا تو بہت خوش ہوئیں۔ بہت دنوں سے انہوں نے اپنے بیٹے کو نہیں دیکھا تھا۔ دوپہر کا وقت

تھا۔ بولے 'اماں! ہم کباب لے کر آئے ہیں۔ اگر زحمت نہ ہو تو دستر خوان لگا دیجئے، ٹھنڈے ہو جائیں گے'۔

محترمہ نے دستر خوان لگایا اور اس پر ہری سبزی اور روٹیاں لا کر رکھیں۔

'یہ کباب صرف تمہارے ہیں، میں فقط روٹی اور سبزی کھاؤں گا'۔

میں نے بہت اصرار کیا لیکن نہ مانے۔ 'مجھے کباب اچھا نہیں لگتا'۔ اور میں جانتا تھا کہ یہ اچھا نہ لگنا ان کے جسم کی نہیں روح کی کیفیت ہے، ان کی روح کو کباب اچھا نہیں لگتا۔ وہ اس طرح سے اپنے کو تکلیف میں رکھتے تھے تاکہ ان کے اور معاشرہ کے غریب ترین افراد کے معیار زندگی میں کوئی فرق نہ ہو۔

کھانے کے بعد آپ نے اپنی والدہ سے پوچھا 'شہر کی کیا خبر ہے'؟

فرمایا 'کوئی خاص نہیں! پہلے کی طرح کبھی کبھی ریڈیو پر 'غزوات پیغمبر ﷺ' نامی پروگرام نشر ہوتا ہے۔ کچھ دن پہلے تمہاری آواز مسجد کے لاؤڈ اسپیکر سے سنی۔ لاؤڈ اسپیکر پر ریڈیو لگا رکھا تھا۔ کبھی کبھی یہ ریڈیو والے تمہاری پوچھتے

ہیں، کہتے ہیں ' نہج البلاغہ کے کچھ اسباق '[2] نامی پروگرام بہت پسند کیا گیا ہے، اسے جاری رکھنا چاہتے ہیں۔

'اب نہج البلاغہ پڑھانے کا موقع نہیں ملتا۔ ہاں! نہج البلاغہ پر عمل کا موقع ضرور مل رہا ہے '۔

'کیسے '؟

'ہویزہ جا رہا ہوں اماں! وہاں کی یونٹ کی ذمہ داری میں نے قبول کر لی ہے۔ سخت امتحان کا مرحلہ ہے، میرے لئے دعا کیجئے '۔

'میں ہر روز تم سب کے لئے دعا کرتی ہوں '۔

حسین نے ہویزہ میں اپنی پینتالیس روزہ کمانداری کے دوران جو کارہائے نمایاں انجام دیے ان سب کا تذکرہ میرے بس سے باہر ہے البتہ میرا حافظہ بھی ساتھ نہیں دے رہا ہے۔ دوسری بات یہ کہ آپ نے بھی لکھا ہے کہ میں

---

[2]۔ شہید حسین علم الہدی کی یہ تقاریر 'جہاد در قرآن ' نامی کتاب کی شکل میں شہید فاؤنڈیشن کی جانب سے فارسی میں شائع ہو چکی ہیں۔

حسین کے جہاد پر خامہ فرسائی کروں اور اب میرا دل بھی صحرائے ہویزہ اور پانچ اور چھ جون کے آپریشن کا حال لکھنے کے لئے تڑپ رہا ہے۔ لہٰذا 'اشیائے ضروریہ مرکز' میں انہوں نے شہید محمود قدوسی کے ہمراہ جو بڑے پیمانہ پر خدمات انجام دیں ان کے تذکرہ سے صرف نظر کر رہا ہوں۔ ہویزہ کے قبائل کو امام سے ملاقات کے لئے لانا اگر آپ کے علم میں ہے تو آپ چونکہ کہانیاں لکھتے ہیں لہٰذا اس بات کی تصدیق کریں گے کہ حسین کا یہ کارنامہ ایک خاص حسن، ذہانت اور فن کا مظہر ہے۔ اس فن اور مہارت پر میں زور دینا چاہتا ہوں، کیوں؟ یہ آپ خود تلاش کیجئے۔ (اگر اس سلسلہ میں آپ مزید معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ایک دن ہویزہ تشریف لائیے۔ خود ان قبائل کے افراد سے سنتے ہیں کہ حسین نے کس طرح سے اس دوران جب دشمن کی طرف سے شدید حملے جاری تھے ان لوگوں کو مختلف دیہاتوں سے اکٹھا کیا اور پھر اس کا فائدہ کیا ہوا)۔

بہرحال کچھ دن بعد حسین نے باقاعدہ انقلاب محافظ فوج (پاسداران انقلاب) کی ہویزہ یونٹ کی کمان سنبھال لی۔ سب سے پہلے ہم سوسنگرد گئے اور

وہاں ادھر ادھر پراکندہ جوانوں کو اکٹھا کیا، ان میں شہید محمد علی حکیم اور شہید غفار درویشی بھی تھے۔ حسین بولے 'سب ہویزہ چلتے ہیں'۔

ہم چلے۔ ہویزہ میں پہلے ہی ہماری آمد کی خبر پھیل چکی تھی۔ ہم رات میں پہنچے، ہمارے ساتھی حاجی عبد الامیر کے گھر میں ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ گھر خالی تھا۔ نماز کے بعد ایک کارٹون لایا گیا جو کچھ بھیگ بھی چکا تھا۔ اس میں مجھے یاد ہے رات کے کھانے کے لئے ابلے ہوئے انڈے اور آلو تھے۔ ساتھی یہ دیکھ کر خوش ہوئے جا رہے تھے کہ ہم پھر سے منظم ہو رہے ہیں۔ ہم دس افراد رہے ہوں گے۔ ہاں مجھے یاد آیا کہ حاجی یونس شریفی، حسین احتیاطی اور قاسم نیسی بھی ہمارے ساتھ تھے۔ کھانے کے بعد حسین نے گفتگو کا آغاز کیا۔

'کچھ دن پہلے ہم اہواز گئے اور وہاں تھوڑی دیر کے لئے جزائری مسجد بھی گئے۔ آپ جانتے ہی ہوں گے کہ وہاں برادر گندمکار، برادر پیرزادہ اور دیگر شہداء کے ایصال ثواب کے لئے قرآن خوانی اور مجلس عزاء کا انعقاد کیا گیا تھا۔ صوبہ کے تمام اعلیٰ حکام بھی وہاں موجود تھے لہٰذا مجلس کے بعد مجھے یہاں

کے حالات سے انہیں آگاہ کرنے کا موقع مل گیا۔اس کے بعد ہم برادر شمخانی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آخر کار یہ ذمہ داری خود میرے کندھوں پر ڈال دی گئی۔ بہر حال مجھے امید ہے کہ میں ذمہ داری اچھی طرح نبھا سکوں گا اس کے لئے مجھے فرداً فرداً ہر ایک کے تعاون کی ضرورت ہے۔کسی معمولی سے اقدام کے ذریعہ ہم شہداء سے پیدہ شدہ خلاء پر نہیں کر سکتے لہٰذا ہمیں آنے والے دنوں میں سخت محنت کرنا ہوگی اوراس کی شروعات کے لئے متحد اور یکجا ہونا پڑے گا۔ شہر اور اس کے نواحی علاقوں میں پراکندہ ساتھیوں کو اکٹھا کرنا ہو گا اور ساتھ ہی آج ہی ہم سب کی ذمہ داریاں متعین ہو جانے چاہئیں'۔

'ذمہ داریاں تقسیم کرنے کی اتنی جلدی کیا ہے؟ہمیں فوری طور پر جس چیز کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ جلد از جلد جوانوں کو اکٹھا کرتے ہیں اور دشمن پر حملہ کر دیتے ہیں۔ ہمیں سولہ نومبر کے شہداء کا انتقام لیناہے'۔

'جی نہیں! ہمیں جذبات میں آکر کوئی قدم نہیں اٹھانا ہے۔ ہم میں سے ہر ایک کی ذمہ داری معین ہونی چاہئے تاکہ ہم میں نظم و ضبط قائم رہے۔ اس کے علاوہ ہمیں تازہ دم ہونے کی بھی ضرورت ہے، ہر شخص کو تیار ہونا ہوگا۔ یہ ہم سب کے لئے فخر کی بات ہوگی کہ ہم مقدس اہداف کے لئے جان قربان کر دیں اور شہید ہو جائیں لیکن یہ شہادت اس وقت اور بھی بافضیلت ہوگی جب ہم اپنے وجود سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھاتے ہوئے دشمن کو کراری چوٹ پہنچائیں۔ میں کل اہواز واپس جاؤں گا اور ضرورت کا سازوسامان لے کر آؤں گا۔ انشاء اللہ آپ لوگوں کے لئے اسلحہ بھی لے کر آؤں گا، وہ اسلحہ بھی جو ہاتھ میں تھامیں گے اور وہ اسلحہ بھی جو آپ کا ہاتھ تھامے گا'۔

میں نہیں سمجھ سکا کہ حسین کیا کہنا چاہتے ہیں لیکن جب دیکھا کہ آپ اسلحہ کے ساتھ ساتھیوں میں نہج البلاغہ بھی تقسیم کر رہے ہیں تو پتہ چلا کہ ہمارا ہاتھ تھامنے والے اسلحہ سے آپ کی مراد کیا تھی۔ آپ اہواز سے کچھ تازہ دم جوان بھی لے کر آئے۔ ابن سینا کالج کو ہم نے اپنا ہیڈ کوارٹر بنایا اور از سر نو منظم ہونے کا کام شروع کر دیا۔

صبح تڑکے نماز کے بعد حسین نے سب کو لائن میں کھڑا کیا۔

'برادران مہربانی کر کے دو صفیں بنا لیجئے'۔

سب لائن میں کھڑے ہو گئے۔

'چلنے کے لئے تیار ہو جایئے'۔

ہم کالج سے نکلے۔وہ ٹھنڈک اور کہرا کہ نہ پوچھئے۔شہر کے اطراف کے چشموں کی خوشبو ہویزہ شہر کی سنسان سڑکوں تک پھیلی ہوئی تھی، کہیں سے کوئی فائر کی آواز بھی نہیں آ رہی تھی، صرف ہمارے بوٹوں کی آواز ہی خاموشی توڑ رہی تھی۔

'ایک۔۔۔دو۔۔۔تین۔۔۔چار۔۔۔'!

ابھی بھی سید کی آواز میرے کانوں سے ٹکرا رہی ہے۔ صبح صبح دوڑنے سے عجیب سا احساس ہوتا تھا جسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اجڑے اور نیم تباہ شدہ گھر ہمیں تعجب سے دیکھ رہے ہوں اور اپنے آپ سے

پوچھ رہے ہوں' یہ لوگ یہاں کیا کر رہے ہیں؟ کیا اب بھی اس شہر میں کوئی بستا ہے'؟

آہستہ آہستہ ہم شہر سے نکلتے اور سوسنگرد روڈ پر دوڑنے لگتے۔ وہیں تک آتے آتے کچھ ہار مان جاتے اور کبھی کسی کی آواز آتی 'بس کرو سید! کتنا دوڑاؤ گے؟ اب طاقت نہیں رہی'۔

حسین سب سے آگے رہتے اور تھکنا تو شاید ان کی لغت میں تھا ہی نہیں۔ ہمیشہ کی طرح مسکرا کر کہتے 'ابھی کچھ چلے ہی نہیں ہیں، اتنی جلدی شکایت کرنے لگے، کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ لوگوں نے میرے خلاف کوئی سازش کر رکھی ہے'۔

مجھے پتہ تھا کہ وہ مشہد میں طالب علمی کے زمانہ میں ہر ہفتہ پہاڑوں کی سیر کرتے تھے تو میں اپنی معلومات سے (غلط) فائدہ اٹھاتے ہوئے کہتا تھا 'حسین تمہیں مشق ہے، کوہنوردی کرتے رہے ہو اور مجھے پتہ ہے اکثر روزہ بھی رکھتے

تھے۔ تم نے خود کو ان سختیوں کے لئے تیار کر رکھا ہے لیکن ہماری شروعات ہے۔ اتنی سختی مت کرو'۔

پھر مسکرا کے کہتے 'ان باتوں سے میں ماننے والا نہیں ہوں'۔

اس کے بعد جب سب گر پڑتے تو کہتے 'یہاں تک مزاحمت تھی اب اس کے بعد ثابت قدمی کا مرحلہ ہے۔ دیکھتے ہیں ہم میں ثابت قدمی کس قدر ہے'۔

شہید احتشام زادہ حال ہی میں ہویزہ آئے تھے۔ پہلے دن جب ہم ورزش کے لئے تیار ہو رہے تھے تو پوچھنے لگے 'مشق کون کرواتا ہے'؟

میں نے جواب دیا 'حسین'۔

ان کی صحت بہت اچھی تھی، قوی ہیکل تھے کہنے لگے 'حسین؟ حسین کیا ہمارے ساتھ دوڑ بھی پائیں گے'؟

میں نے کہا 'کوئی بات نہیں دیکھ لیجئے گا'۔

وہ کچھ نہیں بولے واضح تھا کہ انہوں نے میری بات سنجیدگی سے نہیں لی ہے۔ہم نے صفیں بنائیں اور دوڑنا شروع کر دیا۔ حسب معمول حسین سب سے آگے تھے۔ایک ایک کر کے سڑکوں سے گذرتے ہوئے شہر سے نکل آئے۔کچھ دیر بعد کئی ساتھی پیچھے رہ گئے۔ شہید احتشام زادہ بھی بہت تھک چکے تھے، میں جب ان کے پاس پہنچا تو پوچھا 'کیا حال ہی بھئی '؟

ہانپتے ہانپتے بولے 'اتنا تو سوچا ہی نہیں تھا میں گرا جا رہا ہوں '۔

میں نے کہا 'ابھی تو ہوا ہی کیا ہے '۔

حسین اتنا دوڑتے رہے کہ تقریباً سب پیچھے رہ گئے لیکن وہ نہیں رکے اکیلے ہی دوڑتے رہے اور پھر دور ایک جگہ رک کر ہمار انتظار کرنے لگے یہاں تک کہ ہم گرتے پڑتے وہاں تک پہنچے۔بولے 'بہت اچھا! اب دائرہ بنا لیجئے ورزش کرتے ہیں '۔

شہید احتشام زادہ نے میرے پاس پہنچ کر بے یقینی سے کہا 'اب ورزش بھی کرائیں گے '؟

میں نے پھر وہی کہا' ابھی تو ہوا ہی کیا ہے'۔

ان کے چہرہ کا رنگ اڑ گیا اور اب انہیں آہستہ آہستہ میری بات سمجھ میں آنے لگی تھی۔ آدھا گھنٹہ ورزش کی۔اس کے بعد حسین بولے 'دو صفوں میں کھڑے ہو جایئے دوڑنا ہے'۔

صفیں بن گئیں تو آواز آئی 'ٹھیک ہے! اب ہیڈ کوارٹر تک دوڑنا ہے'۔

میں نے احتشام زادہ کی طرف دیکھا تو بہت گھبرائے ہوئے تھے۔ میں نے کہا 'دعا کرو جلد قبرستان پہنچ جائیں'۔

'قبرستان'!

بے چارے سوچنے لگے کہ شاید موت ہی اس سخت ورزش سے نجات کا واحد ذریعہ ہے لیکن میری مراد یہ تھی کہ صرف قبرستان ہی وہ جگہ ہے جہاں حسین آرام سے چلنے کی اجازت دیتے ہیں'۔

خدا خدا کر کے قبرستان بھی پہنچ گئے۔ یہاں صرف مردے ہی آرام نہیں کرتے بلکہ ہمیں بھی یہاں پہنچ کر سانس لینے کا موقع ملتا ہے۔

حسین کی آواز آئی 'اب دوڑنا ضروری نہیں ہے'۔ ہم قبروں کے پاس سے گذرنے لگے۔ قبروں کے درمیان جگہیں خودرو گھاس سے پر تھیں، زمین شبنم سے بھیگی تھی، کہرے کے باعث بہت مشکل سے اطراف میں کوئی شے دکھائی دیتی تھی، قبرستان بہت پر اسرار محسوس ہو رہا تھا۔ اسی دوران حسین نے گفتگو شروع کی:

'ایک بار امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام اپنے اصحاب کے ہمراہ کہیں جارہے تھے کہ آپ کا گذر ایک قبرستان سے ہوا۔ آپؑ نے اپنے اصحاب سے فرمایا 'رک جایئے' جب سب رک گئے تو آپؑ نے پوچھا 'کیا آپ لوگ جانتے ہیں کہ مردے آپ سے باتیں کرتے ہیں'؟ لوگوں نے کہا 'نہیں' حضرتؑ نے فرمایا 'ہاں یہ آپ لوگوں سے باتیں کرتے اور کہتے ہیں کہ افسوس کہ وقت ہمارے ہاتھ سے نکل چکا ہے اور ہماری زندگی ختم ہو گئی ہے۔ اب ہمارے

اورآپ کے درمیان اگرچہ ایک میٹر سے زیادہ کا فاصلہ نہیں لیکن ہم کچھ بھی کرنے سے قاصر ہیں، کوئی نیک کام انجام نہیں دے سکتے۔ لیکن آپ لوگوں کے پاس وقت ہے، اسے ہاتھ سے مت جانے دیجئے'۔

حسین ایک قبر کے پاس کھڑے تھے اور ایسے بول رہے تھے کہ ہمارے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ جیسے خود امیر المؤمنینؑ ہمارے سامنے کھڑے ہم سے مخاطب ہوں، جیسے زمان و مکان کا فاصلہ ختم ہو گیا ہو، کوفہ اور ہویزہ کے درمیان کتنا فاصلہ ہے؟

اس دن حسین کی باتوں کا ہم کیا اثر ہوا بیان کرنا ممکن نہیں ہے۔ وہ جب بول رہے تھے تو ان کے سر اور داڑھی پر شبنم کے دانے نظر آرہے تھے اور کہرا اور دھند ہمارے اطراف میں ہچکولے کھا رہی تھی۔ چاروں طرف مکمل خاموشی تھی۔ نہ کسی مارٹر شل کی آواز آرہی تھی اور نہ ہی پرندوں نے ہی چہچہانا شروع کیا تھا۔ جیسے اسی لمحہ کائنات خلق ہو رہی ہو اور ابھی بہت کچھ خلق ہونا باقی ہو۔ سب کچھ ایسا نیا نیا جیسے ابھی خلق ہوا ہو اور ہم سے کوئی

نوجوان نہیں بلکہ تجربہ کار اور ضعیف العمر شخص خطاب کر رہا ہو۔ سر کے بال سفید ہو گئے تھے، کچھ سفید اور کچھ سیاہ۔ ہاں چہرہ پر وہی چمک تھی، وہی ان کی آنکھوں کی مخصوص چمک۔

اس دن عجیب ہی حالت تھی جیسے کوئی اس دنیا میں ہو ہی نہ۔ حسین کچھ عرصہ کے لئے ہم سب کو دوسری دنیا میں لے گئے تھے۔ یہ میں اس وقت سمجھا جب ہم ہیڈ کوارٹر واپس پہنچے اور دوسروں کا حال بھی پتہ چلا۔

بہر حال دن ایسے ہی گذرتے گئے اور حسین آپریشن کے لئے فوج تیار کرتے رہے:

'ہمارے پاس دشمن پر حملہ کے لئے ایک منصوبہ ہونا چاہئے، ایک لمحہ کے لئے بھی انہیں سکون کی سانس نہ لینی دی جائے اور ایک رات کے لئے بھی انہیں یہ احساس نہ ہو کہ محفوظ ہیں۔

ابھی سارے جوانوں کو اکٹھا نہیں کر پائے ہیں۔ ابھی بہت سے شط علی گاؤں میں مستقل طور پر مصروف عمل ہیں اور براہ راست سوسنگرد یا اہواز کے زیر نگرانی ہیں۔ ان کو بھی اپنے ساتھ ملانا ہے۔

البتہ میں نے ان کے بارے میں بات کر لی ہے اور یہی طے پایا ہے کہ وہ بھی ہویزہ کے زیر نگرانی ہی رہیں، کل ان کے پاس چلنا ہے'۔

دوسرے دن ہم شط علی پہنچے۔ وہاں انقلاب محافظ فوج کے جوانوں نے اپنی چوکی قائم کر رکھی تھی۔ جب ہم وہاں پہنچے تو دیکھا کہ وہ لوگ بہت پریشان ہیں۔

'کیا بات ہے'؟

'ہمیں یہاں سے جانا ہو گا، کچھ پتہ ہی نہیں چل رہا ہے کیا ہو رہا ہے لیکن اب یہاں رہنا ممکن نہیں لگتا'۔

'آپ لوگ خود کو ہویزہ یونٹ کے انڈر رکھیے اور یہیں رہیے'۔

'کون کہہ رہاہے ایسا کرنے کو؟ آپ لوگ کون ہیں؟ کس کی اجازت سے یہاں آئے ہیں؟ جلدی یہاں سے نکلتے بنئے'۔

مجھے ان کے اس رویہ سے سخت کوفت ہوئی جواب دیناچاہالیکن حسین نے منع کر دیااور ہمیشہ کی طرح مسکراکر ان کی طرف آگے بڑھے اور کہا:

'ہمیں اندر نہیں بلائیں گے؟ یہاں گفتگو کرنا ممکن نہیں ہے'۔

انہوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور بادل نخواستہ ہمیں اپنے کمرہ میں بلا لیا۔ میں حسین کے ساتھ ان کے رویہ پر بہت ناراض تھالہٰذا میں نہیں گیالیکن حسین چلے گئے۔ میں گاڑی کے پاس کھڑارہااور اپنے آپ سے کہنے لگا' مجھے لگتاہے ان لوگوں سے نہیں بن پائے گی۔ ان میں ہویزہ یونٹ کے کمانڈر سے توہین آمیز لہجہ میں بات کرنے کی ہمت کیسے ہوئی'؟

یہی سب سوچ رہاتھا کہ ایک مرتبہ دیکھا حسین اور وہ لوگ کمرہ سے نکل رہے ہیں۔ حسین مسکرا رہے تھے اور وہ لوگ شرم سے سر جھکائے ہوئے

تھے۔ میں نے غور سے ان کے چہرے دیکھے کہ حسین چند منٹ میں ان کے اندر کیونکر انقلاب لے آئے ہیں؟

'ہم معافی چاہتے ہیں برادر علم الہدیٰ، معاف کر دیجئے گا'۔

رخصت کے وقت سب نے آپ کے گلے لگ لگ کر آپ کے بوسے لئے۔

'ہم خون کے آخری قطرہ تک یہاں ڈٹے رہیں گے۔ آپ مطمئن رہئے۔ جب ضرورت پڑی تو آپ کی خدمت میں حاضر ہو جائیں گے'۔

جب ہم لوگوں نے واپسی کی راہ لی تو میں نے پوچھا 'آپ نے ان کے ساتھ کیا، کیا کہ یکبارگی ان میں انقلاب آگیا؟ میں اپنے کو جھگڑنے کے لئے تیار کر رہا تھا'۔

'یہ بہت اچھے جوان ہیں۔ ان کے ساتھ اچھے برتاؤ کی ضرورت تھی اور میں نے یہی کیا۔ حکم اور آرڈر کے ذریعہ ہم آگے نہیں بڑھ سکتے۔ ہمیں یکدل ہونا ہے۔ جو لوگ مزاحمت کرنا چاہتے ہیں انہیں پتہ ہونا چاہئے وہ کیوں مزاحمت

کر رہے ہیں، جن کو جان دینا ہے ان کو پتہ ہونا چاہئے وہ کیوں جان دے رہے ہیں'۔

ہم شہر واپس آ رہے تھے۔ ہر طرف گہرا کہرا تھا، راستہ بمشکل دکھائی دے رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد مجھے احساس ہوا کہ سڑک انجان ہے۔ گاڑی روکی اور نیچے اتر آیا۔

حسین نے پوچھا'کیا ہوا'؟

'لگتا ہے ہم کھو گئے ہیں'۔

آپ بھی نیچے اترے، آس پاس دیکھا لیکن اس سے کیا حاصل ہونا تھا۔ پتہ ہی نہیں چل رہا تھا ہم کہاں ہیں۔ آخر میں انہوں نے کہا'اسی راستہ پر چلتے ہیں، اگر اصلی شاہراہ پر پہنچ گئے تو پتہ چل جائے گا کہ ہم کھوئے نہیں ہیں'۔

کوئی چارہ تو تھا نہیں۔ چل دیے البتہ کچھ دیر بعد اصلی شاہراہ آ گئی۔ حسین کسی سوچ میں گم تھے۔

'کیا سوچ رہے ہیں'؟ میں نے پوچھا۔

'ایک عزیز کی یاد آگئی'۔

'کس کی'؟

'رضا کی'۔

'پیرزادہ'

'ہاں! ہم نے بڑے اچھے دن گذارے۔ میں رضا کے ساتھ نہج البلاغہ کا مطالعہ کرتا تھا اور اصغر گندمکار کے ساتھ قرآن کا۔ اب دونوں ہی نہیں ہیں اور مجھے عجیب سی تنہائی محسوس ہو رہی ہے البتہ امید ہے کہ ہم زیادہ دن ایک دوسرے سے جدا نہیں رہیں گے۔ میرا دل کہہ رہا ہے کہ میں زیادہ ان سے دور نہیں رہوں گا'۔

'اگر رضا ہوتے تو آج ہم یوں گم نہ ہوتے'۔

'ہاں اس لحاظ سے تو ان کی جگہ پر ہونا بہت مشکل ہے۔ وہ اس علاقہ کے چپہ چپہ سے آگاہ تھے، یہاں کی انٹیلجنس معلومات کا حصول ان کے ذمہ تھا۔ اس وقت ہمیں ایک ماہر درکار ہے جو اس علاقہ کو خوب جانتا ہو۔ میں نے سوچا ہے کہ اسی شخص کو ڈھونڈھا جائے جو ایک بار ملا تھا، تمہیں یاد ہو گا نا ہماری گاڑی کے آگے گاڑی لے آیا تھا۔۔۔'۔

'لیکن وہ ہم سے کیسے تعاون کرے گا سنا نہیں آپ نے وہ لوگ بتا رہے تھے کہ۔۔۔'۔

'اور بھی لوگوں نے مجھے یہ سب بتایا ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ ہمارے ساتھ تعاون کرے گا۔ میں نے اس کے چہرہ پر کچھ ایسا دیکھا ہے جو دوسرے نہیں دیکھ پائے ہیں'۔

'کوئی فائدہ نہیں سید! کیوں بلاوجہ خود کو اذیت دینا چاہتے ہیں'؟

یہ اور لوگوں نے بھی ان سے کہا تھا لیکن انہوں نے نہیں سنی اور ایک دن کہنے لگے کہ 'آج حسن یہاں آرہے ہیں'۔

'کون حسن'؟

'وہی جن کے پاس جانے سے آپ لوگ منع کر رہے تھے'۔

'اور آپ چلے گئے'؟

'ہاں'۔

'کب'؟

'کل رات'۔

'ہم سے تعاون کے لئے تیار ہو گئے'؟

'کوئی وعدہ تو نہیں کیا لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ آئیں گے'۔

میں نے سوچا' ہمارے سید غلطی کر رہے ہیں۔ چونکہ اپنا دل اتنا پاک ہے لہٰذا سب کے سلسلہ میں حسن ظن رکھتے ہیں۔ انہیں پتہ ہی نہیں کہ لوگ کہتے کچھ اور کرتے کچھ ہیں، ہر ایک پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا'۔

بعد میں جب میں نے سنا کہ حسین نے اپنی کلاشنکوف بھی حسن کی خدمت میں پیش کر دی ہے تو سخت تعجب ہوا۔ ہتھیاروں کے اس قحط میں کوئی اسلحہ گنوانا بہت بڑی بات تھی، اس وقت تو ایک گولی بھی ہمارے لئے بہت قیمتی تھی۔ میں چکرا گیا تھا کہ یہ کیا ہوا ہے، حسین بہت ذہین اور عقلمند تھے۔ یقین نہیں آرہا تھا کہ ایسی بیوقوفی کریں گے۔ میں پریشان ہو گیا اور انتظار کرنے لگا کہ نتیجہ کیا نکلتا ہے۔ اس دن میں ایک دو جگہ گیا، کچھ ٹینک شکن بارودی سرنگیں مل گئی تھیں انہیں ہیڈ کوارٹر پہنچایا۔ اس کے بعد تیل خاکی کے لئے اشیائے ضروریہ مرکز گیا اس لئے کہ عرصہ سے شہر میں بجلی کی ترسیل منقطع تھی۔

غروب کے وقت ہیڈ کوارٹر پہنچا۔ گاڑی صحن میں کھڑی کی اور تیل کے بڑے ٹیل خالی کر رہا تھا کہ دیکھا ایک شخص سنتری سے حسین کی پوچھ رہا ہے۔ سر اٹھا کے دیکھا تو پتہ چلا اس کے ہاتھ میں ایک کلاشنکوف بھی ہے۔ یہ حسین کی کلاشنکوف تھی اور آدمی بھی وہی تھا جسے راہ روی میں کچھ عرصہ قبل شہر میں

دیکھا تھا۔ میرا دل کانپ اٹھا۔ منہ سے نکلا 'اللہ اکبر' اور سنتری سے کہا 'آنے دو اسے'۔

آیا تو میں نے اسے حسین کا کمرہ دکھا دیا۔ مجھے نہیں معلوم ان کے درمیان کیا بات ہوئی اور کیا ہوا بس اتنا معلوم ہے کہ جب حسن باہر آیا تو پوری طرح بدل چکا تھا۔ حسین کی کلاشنکوف ابھی بھی اس کے ہاتھ میں تھی۔ اس دن کے بعد سے حسین نے آر، پی، جی اٹھالی وہی آر، پی، جی جو بعد میں ان کے وجود کا جزء ہو گئی یعنی اس کے بغیر حسین کا تصور ہی نہیں ہوتا تھا۔ ان کی ایک یادگار تصویر ہے جو آپریشن سے کچھ دن پہلے لی گئی تھی اس میں آپ ایک مٹی کے ٹیلہ کے پیچھے کھڑے ہیں، بائیں ہاتھ سے آنکھوں پر سایہ کئے ہیں، گردن میں رومال ہے (جو ہمیشہ ہی رہتا تھا) اور کہیں دیکھ رہے ہیں۔ مجھے یہ تصویر دیکھ کر ہنسی آتی ہے۔ اپنے آپ سے کہتا ہوں یقیناً جو شخص تصویر لے رہا ہوگا اس نے کہا ہوگا اگر زحمت نہ ہو تو ایک منٹ کے لئے آر، پی، جی اتار دیجئے تا کہ ہم تصویر لے لیں۔ اس لئے کہ ان آخری ایام میں ایک لمحہ کے لئے بھی آر، پی، جی نہیں نیچے نہیں رکھتے تھے۔

بہر حال مجھے نہیں معلوم ان دونوں میں کیا بات ہوئی لیکن حسن اس کے بعد سے ہمارے انتہائی مخلص جانباز ساتھی ہو گئے۔ جب انہوں نے کام شروع کیا تب ہم پتہ چلا حسین نے کتنا قیمتی ہیرا ڈھونڈھا اور تراشا ہے۔ (یہیں یہ بھی بتا دوں کہ ایک سال بعد حسن بستان شہر کو دشمن کے چنگل سے چھڑانے کے لئے کئے گئے آپریشن کے دوران شہید ہو گئے۔ میں اس وقت قید میں تھا اور مجھے یہ خبر رہائی کے بعد ملی۔)

میں جب ان کے ساتھ ہوا تبھی مجھے یقین آیا کہ فضول میں یہ مشہور نہیں ہے کہ انہیں اس علاقہ کے چپہ چپہ کی خبر ہے۔ اس سے پہلے یعنی جب وہ ہمارے ساتھ شامل نہیں ہوئے تھے تب ہم رات میں حملہ یا علاقہ کے شناخت کے لئے جاتے تھے تو دشمن پر حملہ یا اس کے حملہ سے بچنے سے زیادہ ان سے جاملنے یا اپنے گم ہونے کی فکر ہوتی تھی۔

'بھائیو! یاد رکھنا اس گڈھے سے دائیں طرف مڑے ہیں'۔

'بھولنا نہیں تالاب کے اوپر سے گذرے ہیں نیچے سے نہیں'۔

'اگر صبح میں کہرا ہوا تو لوٹتے وقت گاڑی کیسے ڈھونڈھو گے'؟

'مجھے لگتا ہے یہ ہمارے سامنے 'مگا سیل' ہے۔ ہم دشمن سے آگے آ چکے ہیں لیکن پتہ نہیں چلا ہے۔ نقشہ پر لگی علامتوں سے پتہ چلتا ہے کہ عراقی ہویزہ سے تین کلو میٹر کے فاصلہ پر ہیں۔ ہمیں گھوم کر ان کے پیچھے پہنچنا تھا تو اب تک پہنچ جانا چاہئے تھا لیکن بیس تیس کلو میٹر چل چکے ہیں اور کہیں پہنچ نہیں پا رہے ہیں۔ اور میں یہ بارودی سرنگ اٹھا اٹھا کے تھک چکا ہوں'۔

لیکن جب حسن ہمارے ساتھ ہوئے تو نہ ہمیں کھونے کا خطرہ تھا اور نہ اندھیرے اور کہرے کا۔ اب ہم اپنے اصل کام پر بھرپور توجہ دے سکتے تھے۔ کہتے تھے 'آپ خالی بتایئے کہاں چلنا ہے وہاں پہنچانا میرا کام ہے'۔

اور پھر یہی ہوتا تھا۔ کبھی کبھی ہمیں دشمن کی دفاعی لائن کے بیک میں جانے کے لئے بہت زیادہ فاصلہ طے کرنا پڑتا تھا اور جہاں تک ممکن ہوتا تھا وہاں وانٹ وغیرہ سے جاتے تھے۔ ہر آدمی اپنے ساتھ ایک ٹینک شکن بارودی سرنگ، ایک بندوق، چند میگزین اور کچھ وقت کے لئے کھانا رکھتا تھا۔ تیس کلو

کے قریب بوجھ ہو جاتا تھا۔ حسین بارودی سرنگ کے علاوہ آر، پی، جی بھی ہمیشہ ساتھ رکھتے تھے۔ اگر رات میں جاگنے وغیرہ کا تذکرہ کروں تو خط میں کئی صفحے بڑھ جائیں گے۔ جاگنے کی وجہ سے آنکھیں لال ہو جاتی تھیں۔ رات کی ٹھنڈک سے جلد پھٹ جاتی تھی۔ کبھی کبھی بارش بھی ہو جاتی تو ہم یا تو چھوٹے چھوٹے درختوں کی پناہ میں چلے جاتے یا چلتے رہتے اور بھیگتے رہتے۔ جب بارش ہوتی تو راستوں پہلے سے بھرا پانی اور بھی بڑھ جاتا۔ کبھی پانی میں ہی اتر جاتے یا پھر گھٹنوں تک مٹی اور دلدل میں لتھڑے کنارے سے گذرتے۔

اس سب پر آپ کو مشکل سے یقین آئے گا اور آنا بھی نہیں چاہئے اس لئے کہ میں آج بیس سال بعد سوچتا ہوں تو خود مجھے یقین نہیں آرہا کہ یہ سب ہم کرتے تھے۔ دشمن سے اتنا قریب ہو جاتے تھے کہ ان کی باتیں بھی سنائی دیتی تھیں، چلتے پھرتے یا گاڑیاں ایک جگہ سے دوسری جگہ ہٹاتے نظر آتے تھے۔ ان کے ایک ٹھکانہ کا تو ہمیں یہ بھی پتہ تھا کہ وہاں کب سنتریوں کی ڈیوٹی بدلتی ہے۔۔۔ ایک چھوٹا سا راستہ مورچوں سے مختصر سی خندق کو جاتا تھا۔ اس خندق پر پچاس میٹر کے فاصلہ سے کنکریٹ کے مورچے بنا رکھے تھے جن پر

چار گھنٹے بعد سنتریوں کی ڈیوٹی بدلتی تھی۔ جس رات ہم وہاں گئے تب تک رکے رہے جب تک راحت رساں سنتری آ کے جاتا۔ راحت رساں سنتری ہر پینتالیس منٹ پر سارے مورچوں کا چکر لگاتا تھا۔ خندق کے عقب میں ایک کچا راستہ تھا جو خود عراقیوں نے بنا رکھا تھا اور اسی سے انہیں رسد پہنچائی جاتی تھی۔

اس رات ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی اور مٹی، گھاس اور جھاڑیوں کی خوشبو چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ سخت تھک چکے تھے۔ گاڑی سے اترنے کے بعد دس کلو میٹر چل چکے تھے۔ حسن، حسین کی دی ہوئی کلاشنکوف کے ساتھ سب سے آگے تھے، ان کے پیچھے آر، پی، جی اٹھائے خود حسین تھے۔

'کاش تھوڑا تازہ دم ہونے کا موقع مل جاتا' کسی کی آواز آئی۔

حسین نے پوچھا 'کون تھا'؟

وہی آواز دوبارہ آئی' کوئی نہیں۔ آپ نے کچھ سنا کیا'؟

اندھیرے میں حسین کے دانت چمکے' رک جاؤ حسن! بہتر ہے تھوڑا آرام کر لیتے ہیں'۔

پھر وہی آواز آئی (مجھے یاد نہیں کہ شریفی تھے، حکیم تھے یا قدوسی)'آرام کس لئے سید؟ تھک گئے ہیں کیا'؟

اس بار حسین کا قہقہہ بلند ہوا'ہاں بھائی تھک گیا ہوں'۔

اور وہ برادر بھی ماننے والے نہیں تھے 'تمہاری اپنی غلطی ہے۔ صبح میں اتنا زیادہ دوڑ لیتے ہو'۔

کندھے سے سامان اتارا اور زمین پر ڈھ گئے۔چاند ابھی ابھی نمودار ہوا تھا۔ آسمان میں جابجا کالے بادل دکھائی دے رہے تھے۔بارش آہستہ آہستہ رک رہی تھی اور اب سرد ہواؤں کی باری تھی۔عام طور پر ایسا ہی ہوتا تھا۔

'کچھ کھانا نہیں ہے'؟

ہم نے کھانے کا سامان نکالا۔

'اے خدایا! بسکٹ کھا کھا کے مر گئے ہیں'۔

'آؤ میں کین بند چنے بھی لایا ہوں، کھولو مل کے کھاتے ہیں'۔

'ٹھنڈا کین بند کھانا کون کھائے گا'؟

'یہ کون سی بڑی بات ہے۔ آگ جلا کر گرم کر لیں گے'۔

'تو چائے بھی چڑھا دیجئے گا'۔

'اور عراقیوں کو بھی بسم اللہ کہہ دیجئے گا'۔

سب لوگ ہنسی مذاق کر کے تھکن دور کر رہے تھے جبکہ حسن تھوڑے فاصلہ پر ایک بلندی پر بیٹھے تھے۔

'وہاں کیوں بیٹھے ہیں حسن صاحب، کچھ کھانا نہیں ہے کیا'؟

'ہاں کھانا ہے بھائی، یہیں کچھ کھالوں گا'۔

'تو نیچے ہی آجاتے'۔

'نہیں یہاں کا کچھ پتہ نہیں ہے۔ کہیں کوئی گھات لگائے نہ بیٹھا ہو اس لئے ایک آدمی کا پہرہ دیناضروری ہے'۔

وہ بڑے غور سے سامنے دیکھ رہے تھے اور کچھ پریشان لگ رہے تھے۔ میں نے سوچامیں بھی انہیں کے پاس جاکے بیٹھتا ہوں۔ میں نے جاکے مذاق میں کہا 'کیا ہوا حسن؟ حسین سے ناراض ہیں کیا؟ کہیں آپ کو حد سے زیادہ تو تکلیف نہیں دے رہے ہیں'؟

'کیا کہہ رہے ہو حسین؟ حسین نور کا ٹکڑا ہیں۔ وہی میرا ہاتھ تھام کر مجھے اندھیرے سے روشنی میں لائے ہیں۔ وہ اگر کہیں کہ ابھی مر جاؤ تو مر جاؤں گا'۔

'مذاق کر رہا ہوں بھائی۔ جانتا ہوں جتنا آپ کو حسین سے محبت ہے اتنا ہی وہ بھی آپ کو چاہتے ہیں'۔

'حسین کو کون نہیں چاہتا۔ آپ لوگوں کو یہاں کے دیہاتوں کی خبر نہیں ہے۔ آپ کو کیا پتہ انہوں نے یہاں کے لوگوں کے دلوں میں کس قدر اپنی

محبت جاگزین کر رکھی ہے۔ جنگ سے پہلے عراق نے بھاری مقدار میں یہاں کے سرحدی علاقوں میں رہنے والے قبائل اور خانہ بدوش لوگوں میں ہتھیار، گولیاں اور سب سے بڑھ کر کھانے پینے کی چیزیں تقسیم کی تھیں۔ ہمیں نہیں معلوم تھا وہ ایسا کیوں کر رہا ہے؟ کیوں اتنی مہربانی دکھا رہا ہے؟ کچھ لوگوں پر یقیناً اس کا اثر ہوا اور کہنے لگے کہ صدام اتنا بھی برا آدمی نہیں ہے۔ دوسری طرف یہ لوگ عراقیوں کی زبان تو اچھی طرح سمجھتے تھے لیکن فارسی کمزور ہونے کی وجہ سے انقلاب اور امام خمینیؒ کو ٹھیک سے نہیں سمجھ پائے تھے۔ حسین جب انہیں اکٹھا کر کے امام خمینیؒ کے پاس ملاقات کے لئے گئے تو ان میں ایک سو اسی ڈگری تبدیلی آگئی اور سمجھ گے کہ حکام کے نزدیک ان کی بھی اہمیت ہے۔ ذرا سوچئے! ایک ایسے وقت میں جب سخت لڑائی چل رہی تھی ہم ایک خصوصی ریل گاڑی سے امام خمینیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس عجیب اور تاریخی ملاقات کے بعد اب اگر آپ دیہاتوں میں مثلاً میرے ہی گاؤں میں جائیں تو آپ کو اندازہ ہو گا کہ لوگ کتنا بدل چکے ہیں۔ اب سب قربانی دینے کے لئے تیار ہیں'۔

'تو آپ ان کے بارے میں سوچ رہے تھے'؟

'نہیں میں یہ سوچ رہا تھا کہ میں اس سے پہلے بھی ان راستوں سے گذرتا رہا ہوں لیکن اس وقت مقصد کیا ہوتا تھا اور آج مقصد کیا ہے'۔

کچھ کہنا چاہتا تھا کہ انہوں نے چپ رہنے کا اشارہ کیا اور خود غور سے کچھ سننے لگے۔

'یہ آواز سنائی دے رہی ہے'؟

'نہیں'۔

'ایک گاڑی ان کی دفاعی لائن کی طرف آرہی ہے'۔

میں نے کان کے پاس ہاتھ رکھ کر ہوا کی آواز روکنے کی کوشش کی، مشکل سے ہی کچھ سنائی دے رہا تھا۔

حسن نے ساتھیوں کی طرف مڑے اور کہا:

'ان کی دفاعی لائن پر کچھ ہو رہا ہے'۔

حسین اور باقی لوگ ہم جہاں بیٹھے تھے وہاں آ گئے۔

'کچھ دکھائی بھی دے رہا ہے'؟

'ابھی نہیں صرف آواز سنی جا سکتی ہے'۔

'ہم وہاں سے کتنی دوری پر ہیں'؟

'ان کی لائن سے تو دو کلو میٹر کے فاصلہ پر ہیں لیکن وہاں تک جانے والا راستہ نزدیک ہے۔ تھوڑا چکر لگانا پڑے گا'۔

'ہماری افواج اس وقت کس طرف ہیں'؟

'بالکل ہمارے سامنے'۔

'یعنی ہم دشمن کی لائن کے عقب میں ہیں'؟

'تقریباً'

کچھ دیر بعد ہمیں گاڑیوں کی لائٹیں دکھائی دیں۔

'بارودی سرنگیں وہیں نصب کرنا پڑیں گے'۔

'جلدی تیار ہو جایئے۔ اب وقت نہیں ہے'۔

سامان اکٹھا کیا اور ایک دوسرے کے پیچھے چل دیے۔ برسات کی وجہ سے جگہ جگہ پانی جمع ہو جانے کے باعث ان لوگوں نے سڑک کچھ اونچی کر رکھی تھی لہٰذا اس پر بارودی سرنگ نصب کرنا قدرے مشکل تھا البتہ گاڑیوں کے ٹائروں کی وجہ سے پڑنے والے گڑھے مددگار ثابت ہو رہے تھے۔

'ٹھیک وہیں لگانا جہاں ٹائر کے نشان ہیں'۔

ہم نے کھرپیاں نکالیں اور زمین کھودنا شروع کر دی۔ گیلی ہونے کی وجہ سے کھودنا آسان تھا۔ بس یہ خیال رکھنا تھا کہ پتہ نہ چلے کہ وہاں کسی نے کچھ کیا ہے۔

واضح تھا کہ جیسے ہی پہلی بارودی سرنگ پھٹے گی یہ لوگ پورے راستہ کی چھان بین شروع کر دیں گے لہٰذا ایسا کچھ کرنا تھا کہ انہیں باقی سرنگیں نہ مل پائیں۔ چونکہ راستہ میں چھرے بکھرے پڑے تھے لہٰذا یہ تو طے تھا کہ مائن

ڈٹکٹر ان کے کام نہ آئے گا اور انہیں آنکھ سے دیکھ کے اور ہاتھوں سے ٹٹول کے ہی پتہ لگانا پڑے گا۔

جب بارودی سرنگیں بچھانے کا کام مکمل ہوا تو حسن اور سید یہ دیکھنے کے لئے تھوڑا آگے گئے کہ ہمارے سامنے کیا چیز ہے۔ واپس آئے تو خوش تھے۔

'کچھ ٹینک کھڑے ہیں'۔

'ان کے پاس جایا جاسکتا ہے'؟

حسن بولے 'ہاں سنتری کئی میٹر کی دوری پر ہیں'۔

'ہمارے پاس مزید کتنی بارودی سرنگیں ہیں'؟

'چار، پانچ ہوں گی'۔

'اچھا ہے ہر ٹینک کے سامنے ایک بارودی سرنگ نصب کر دیتے ہیں'۔

'صرف یہ خیال رکھنا ہو گا کہ ہمارا پتہ نہ چلے اگر جھڑپ ہو گئی تو ساری محنت رائگاں جائے گی'۔

آہستہ سے بندوقیں کاک کیں۔ حسین نے بھی آر، پی، جی کارٹریج لگایا اور اس میں گولہ ڈال کر سیفٹی بولٹ کھینچا اور فائر کے لئے پوری طرح تیار کر لیا۔ ایک دوسرے سے چار پانچ میٹر کے فاصلہ کے ساتھ ہم ٹینکوں کی طرف بڑھے۔

میں آج بتا رہا ہوں کہ اس وقت کچھ ڈر سا گیا۔ پہلی بار دشمن کے اتنے قریب گیا تھا۔ البتہ حسین، حسن کے ساتھ کئی بار عراقیوں سے کچھ میٹر کے فاصلہ تک جا چکے تھے۔ وہ لوگ دشمن کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کرنا چاہتے تھے تاکہ اگر ضرورت پڑے تو بڑے پیمانہ پر آپریشن کیا جائے۔

عراقیوں نے مخصوص جگہیں بنا کر وہاں ٹینک کھڑے کر رکھے تھے۔ میں آگے بڑھا پہلا ٹینک دیکھا تو اس کی نال کا رخ اوپر کی طرف تھا جیسے آسمان کو نشانہ بنانا چاہتا ہو۔ میں نے اپنے آپ سے کہا کہ 'کیا ممکن ہے کہ ہم ٹینک کے بالکل نیچے بارودی سرنگ نصب کر دیں اور کسی کو پتہ بھی نہ چلے'۔

حسین نے پہلے سپاہی کو اشارہ کیا کہ مٹی کے ایک ٹیلہ کے نیچے پناہ لے اور اشارہ کر کے بتایا کہ اس طرف سے اپنا خیال رکھے۔ اس کے بعد میری باری

تھی۔ حسین اور دو دیگر سپاہی تھوڑا آگے گئے۔ عراقیوں کا بڑا مورچہ بالکل میرے بالمقابل تھا جس میں سے تھوڑی سی روشنی باہر آرہی تھی، بظاہر لالٹین جل رہی تھی۔ انہیں شاید بجلی کی موٹریں چلانے کا موقع نہیں ملا یا انہوں نے ایسا خود نہیں چاہا۔

میں گیلی خاک پر لیٹا تھا لیکن مورچہ کے دورازہ سے نگاہیں نہیں ہٹ رہی تھیں اس لئے کہ اگر عراقیوں کو ہماری خبر ہو جاتی تو مجھے کسی کو مورچہ سے باہر آنے کا موقع نہیں دینا تھا، سنتریوں وغیرہ کو دوسرے ساتھی سنبھال لیتے۔

کچھ خس خس آواز آئی، میں ایک لمحہ کے لئے ڈر گیا۔ فوراً پلٹ کر دیکھا تو ایک جھاڑی کو ہوا اُڑائے میری طرف لا رہی تھی۔ مخصوص کانٹے دار جھاڑی تھی ہماری طرف کم ہوتی ہے، خیر میری پاس پہنچ کر رک گئی۔ میں نے بھی اطمئنان کی سانس لی۔

کچھ دیر بعد حسین اور بارودی سرنگ نصب کرنے کے لئے جانے والے دیگر ساتھی بھی لوٹ آئے۔

'چلیں'؟

'ہاں چلیئے'۔

آہستہ آہستہ چل کر اسی راستہ پر واپس آ گئے جہاں سرنگیں بچھا کر کے گئے تھے۔اب سر اٹھا کر اور اونچی آواز سے بات کی جا سکتی تھی۔

'نصب کر دیں'؟

'ہاں'۔

'کتنی'؟

'ہر ٹینک کے نیچے ایک۔بس خدا کرے انہیں پتہ نہ چلے، زمین گیلی تھی اور ہمارے پیروں کے نشان موجود ہیں'۔

راستہ سے گذر آئے۔کسی کی آواز آئی 'افسوس کہ ہمیں اپنی محنت کا نتیجہ دیکھنے کا موقع نہیں مل رہا ہے۔میرا دل چاہتا ہے کہ کہیں چھپ جاتے اور صبح تک انتظار کرتے اور دیکھتے کہ ٹینک کیسے پھٹتے ہیں'۔

میں نے کہا' پھر دن میں بھی یہیں رکنا پڑے گا۔ پتہ ہے ہم کتنا چل کے آئے ہیں؟ دن کی روشنی میں اگر واپس جائیں گے تو دکھائی دے جائیں گے'۔

ہم باتیں کرتے جارہے تھے کہ یکبارگی حسن رک گئے، حسن مرکز تھے نا۔

'کیاہوا حسن'؟

'پیٹرول کی بو آرہی ہے۔ آپ لوگ محسوس کررہے ہیں'؟

'پیٹرول کی بو'! میں نے تعجب سے حسن کو دیکھا لیکن انہیں سمجھنے میں غلطی نہیں ہوئی تھی۔ وہیں قریب میں کہیں کوئی گاڑی اسٹارٹ ہوئی تھی اور یہ ہم تب سمجھے جب دیکھا کہ تھوڑا فاصلہ پر برابر سے دو روشنیاں آتی دکھائی دیں جیسے ٹویوٹا گاڑی کچی سڑک پر آنا چاہتی ہو۔ حسین بولے 'کس کی شکایت تھی'؟

'کس چیز کی'؟

'کام کے نتیجہ کی، شاید ابھی دکھائی دے جائے'۔

ہم زمین پر لیٹ گئے اور گاڑی پہلی بارودی سرنگ کی طرف آگے بڑھ رہی تھی۔ یہ بارودی سرنگ میں نے ہی نصب کی تھی لہٰذا اگر نہ پھٹتی تو مجھے ساتھیوں کے سامنے بڑی شرمندگی اٹھانا پڑتی۔ دل میں کہا 'خدایا تیرا آسرا'۔ وہ چند لمحے جن میں گاڑی کو وہاں تک پہنچنا تھا مشکل سے گذرے۔

'تیار رہنا، شاید مقابلہ کرنا پڑے'۔

حسین کی آواز آئی۔ گاڑی بارودی سرنگ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ حسین نے بھی آر، پی، جی اٹھالی۔ میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اچانک ایک دھماکہ کی آواز سنائی دی اور میرا ہاتھ بے ساختہ بندوق کے ٹرائگر پر پہنچ گیا۔ گاڑی کو زبردست جھٹکا لگا اور موٹر سے شعلے بلند ہونے لگے۔ دل تو چاہ رہا تھا کہ تکبیر کہوں لیکن مجبوراً خاموش رہنا پڑا۔

'یہاں سے جلد نکل چلو'۔

دوڑنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ کچھ عراقی گاڑی کی طرف آرہے تھے۔ آگ کے شعلوں کے باعث ٹویوٹا کے آس پاس روشنی ہوگئی تھی۔ کوئی

دروازہ نہیں کھلا تھا۔اس پر سوار لوگ یا مر گئے تھے یا بے ہوش ہو گئے تھے۔ حسن چلائے 'ادھر سے'!اور چلے پڑے۔

'ہم غلط تو نہیں جا رہے ہیں، اس راستہ سے آئے نہیں تھے'۔

'کوئی بات نہیں ہے، شارٹ کٹ چلیں گے'۔

'گاڑی نہ بھول جائے'۔

'مت ڈرو مل جائے گی'۔

ہمارا بوجھ تو ہلکا ہو گیا تھا لیکن اتنا زیادہ پیدل چلنے کی وجہ سے سب تھک چکے تھے۔

'ہم پہنچ کیوں نہیں رہے ہیں حسن؟ تھکن سے حالت خراب ہے'۔

'اگر کہیں تو آپ لوگ یہیں رکئے میں گاڑی لے کر آتا ہوں'۔

'نہیں، آہستہ آہستہ چلیں گے'۔

'اگر بہت تھک چکے ہیں تو راستہ میں کسی دیہات میں بھی چل سکتے ہیں، رفیع دیہات ہمارے راستہ میں ہی ہے'۔

'یہ گاؤں محاصرہ میں نہیں ہے کیا'؟

'ہے لیکن پوری طرح نہیں۔ عراقی گاؤں کے مغرب میں ہیں اور علاقہ پر براہ راست مارٹر شل اور چھوٹا فائر بھی کرتے رہتے ہیں۔ وہاں کچھ مخلص اور اچھے لوگ ہیں جو ہمارے ساتھ تعاون کرتے ہیں۔ کچھ تو ہمارے لئے اپنی جان تک دینے کو تیار ہیں جیسے حاجی طاہر'۔

'انہیں نے گشت پر مامور ایک سپاہی کو پناہ دی تھی نا'؟

'ہاں انہیں نے پناہ دی تھی، بہتر ہے حاجی طاہر ہی کے پاس چلتے ہیں، چائے بھی پیئیں گے اور پناہ دینے کی کہانی بھی انہیں کی زبانی سنیں گے'۔

'اگر سو رہے ہوں تو'؟

'تب بھی کوئی مسئلہ نہیں جب ہمیں دیکھیں گے تو بہت خوش ہوں گے۔ خود کہہ رہے تھے جب بھی ممکن ہو ہمارے پاس آجانا'۔

ہم گاؤں پہنچے۔ کتوں کے بھونکنے کی آوازوں نے ہمارا استقبال کیا اور کچھ دیر بعد حاجی طاہر نے خندہ پیشانی سے گھر کا دروازہ کھولا۔ حسین نے کہا 'معاف کیجئے گا ہم آپ کے آرام میں مخل ہوئے ہیں'۔

حاجی صاحب نے انہیں گلے لگاتے ہوئے کہا 'آپ کو تو پتہ ہے میں آپ سے مل کر کتنا خوش ہوتا ہوں۔ آیئے، اندر تشریف لایئے'۔

ہم اندر داخل ہوئے۔ حاجی صاحب نے لالٹین جلائی اور ہمیں خوش آمدید کہا۔ ہم نے بھی جواب میں ان کا شکریہ ادا کیا۔ حسن اور حسین کو تو وہ پہلے سے جانتے تھے لیکن باقی ہم لوگوں کو پہلی بار دیکھ رہے تھے۔

'دوستو! یہ وہی حاجی طاہر ہیں جن کا ذکر خیر ہو رہا تھا۔ کیا حال ہے حاجی صاحب؟ سب ٹھیک چل رہا ہے'؟

'الحمدللہ، گذر رہی ہے'۔

'کوئی کمی بیشی تو نہیں'۔

'ہاں مشکلات تو ہیں لیکن یہاں کے لوگ قناعت پسند ہیں۔مشکلات سے گھبراتے نہیں۔جب سے آپ لوگوں نے 'اشیائے ضروریہ مرکز' قائم کیا ہے ہماری بہت سی مشکلیں کم ہو گئی ہیں۔امام خمینیؒ سے ملاقات سے بھی لوگ بدل گئے ہیں اب کوئی عراقیوں کے دھوکہ میں نہیں آتا'۔

حاجی صاحب کمرہ سے نکلے اور تھوڑی دیر بعد چائے کی پیالیوں کے ساتھ واپس آئے۔موسم قدرے سرد تھا، چائے کی بڑی طلب ہو رہی تھی۔سب تھکن دور ہو گئی۔اس کے بعد ساتھیوں نے ان سے کہا بتائیں انہوں نے انقلاب محافظ فوج کے ایک سپاہی کو کیسے پناہ دی تھی کیا ہوا تھا؟

'جب محاصرہ ہوا تو ہمارے حوصلے آہستہ آہستہ پست ہوتے جا رہے تھے۔ہم سوچتے تھے ہماری کسی کو کوئی فکر نہیں ہے۔فوج کا کہیں کوئی اتہ پتہ نہیں تھا اور دشمن آئے دن محاصرہ تنگ کرتا جا رہا تھا۔مایوسی مارے ڈال رہی تھی کہ ایک دن گاؤں میں ایک عجیب خبر پھیلی۔ایک ناقابل یقین خبر جس نے آب

حیات کی مانند سب کو مایوسی کی فضا سے نکال دیا۔ میں گھر میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک شخص نے آکر بتایا، علم الہدیٰ گاؤں والوں کو امام خمینیؒ سے ملاقات کے لئے لے جارہے ہیں'۔

میں نے کہا' یقیناً یہ بے بنیاد افواہ ہے'۔

اس نے کہا' نہیں بالکل صحیح ہے۔ اطراف کے گاؤں والے تیاریاں کر رہے ہیں'۔

میں نے کہا' ان حالات میں امام خمینیؒ سے ملنے کے لئے کیونکر جایا جا سکتا ہے'؟

اس نے کہا' کہا ہے کہ کل ہویزہ چلنے کے لئے تیار ہو جایئے'۔

مجھے تب بھی یقین نہیں آیا لیکن جب بس گاؤں پہنچی تو مجھے یقین کرنا پڑا۔ یہ حقیقت تھی۔ ہماری وہ آرزو پوری ہونے جارہی تھی جس کے ہم نے خواب بھی نہیں دیکھے تھے۔ اگلے دن ہویزہ گئے۔ اطراف کے دیہاتوں سے دوسری بسیں بھی آئی تھیں۔ فوری طور پر ہمیں اہواز روانہ کیا گیا اور وہاں سے ریل گاڑی سے تہران کے لئے روانہ ہو گئے۔ تہران پہنچ کر رات میں ایک امام

بارگاہ میں رہے اور دوسرے دن صبح دوبارہ بسوں پر بیٹھے اور جماران گئے۔ جیسے خواب دیکھ رہے تھے۔

ابھی بھی مجھے یہی احساس ہوتا ہے کہ میں خواب دیکھ رہا ہوں۔ کیا ہم اس ہستی سے ملاقات کر سکتے تھے جسے اس سے قبل صرف ٹی،وی پر ہی دیکھا تھا؟ لیکن جب جماران امام بارگاہ کی بالکونی پر امام خمینیؒ اپنے نورانی چہرہ کے ساتھ نمودار ہوئے اور چاروں طرف سے عربی اور فارسی میں نعرے لگنے لگے تو یقین آیا کہ ہاں ہم حقیقت میں امام خمینیؒ کی خدمت میں حاضر ہیں۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے یہ کوئی اور دنیا ہو۔ آپ کا مطمئن چہرہ دیکھ کر مجھے ایسی دلی طاقت ملی کہ سارا ڈر کافور ہو گیا اور یقین ہو گیا کہ ہم اس غیر مساوی جنگ میں کامیاب ہو جائیں گے۔

امام کی تقریر کے بعد ہم نے اپنے رومال ان کی طرف اچھالے جو انہوں نے اپنے ہاتھوں سے متبرک کر کے واپس کئے اور میں اپنے سارے غم بھول گیا

اور اب بیوی بچوں کی فکر ہوئی۔ بازار سے ان کے لئے کچھ تحفے تحائف خریدے اور پھر ہم لوگ ہویزہ واپس آ گئے۔

اس کے بعد عراقیوں کی طرف سے دباؤ بڑھ گیا اور گاؤں کا محاصرہ کر لیا گیا۔ تھوڑے ہی عرصہ بعد کھانے پینے کا سامان ختم ہو گیا۔ اب کچھ کھیتی باڑی کی طرف توجہ دینا تھی اس لئے کہ پتہ نہیں تھا کہ صورتحال کب تک ایسی ہی رہے گی۔ اب تو عراقی فوجی ٹینک اور گاڑیاں لے کر گاؤں میں گھومتے تھے۔ کھیتی کے لئے ان سے تحریری اجازت درکار تھی وگرنہ گاؤں سے نکلنے نہیں دیتے تھے۔ دل تو نہیں چاہ رہا تھا لیکن مجبوراً میں گیا اور اجازت لے آیا۔ سوچا کہ تربوز اور خربوزہ بوؤں، گاؤں کے باہر ایک بغیچہ ہے جہاں ان کی اچھی پیداوار ہوتی ہے۔ میں نے کام شروع کیا۔ ہر روز نماز صبح کے بعد گدھے پر سوار ہو کر کھیت چلا جاتا تھا۔ ایک دن ابھی پو نہیں پھوٹی تھی کہ میں نے پانی میں ایک سایہ سا دیکھا، کوئی دلدل میں پھنسا تھا۔ پہلے میں نے سوچا ایسے ہی وہم سا ہو رہا ہے لیکن غور کیا تو پتہ چلا کہ کوئی انسان ہی ہے۔

گدھے سے اترا اور بلند آواز سے کہا‘ اے! کون ہو تم’؟

جواب نہیں ملا۔ میں نے پھر پوچھا‘ تم کون ہو؟ اور وہاں کیا کر رہے ہو’؟

میں عربی میں اسے پکار رہا تھا۔ جب دوسری تیسری بار کہا تو وہ بولا‘ میں غرق ہو رہا ہوں مجھے بچالو’۔

فارس کی آواز سن کی میں گھبرا گیا۔ تیزی سے اپنے آس پاس دیکھا کہ عراقیوں کو ہمارا پتہ چلا ہے یا نہیں۔ سناٹا تھا۔ گاؤں کے کنارہ تعینات عراقی گارڈ پاس ہی تھا لیکن اس نے ہماری آوازیں نہیں سنی تھیں۔ میں نے خدا کا شکر کیا اور جلدی سے پانی میں اتر گیا۔ پانی تھا کہ برف تھی۔ جب اس کے پاس پہنچا تو دیکھا کہ انقلاب محافظ فوج کی وردی میں ہے، سخت تعجب ہوا۔ میں نے کہا‘ آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟ آپ کو پتہ ہے کہ آپ کہاں ہیں’؟ کہنے لگے ‘کئی گھنٹے سے یہاں پھنسا ہوں اور اب طاقت جواب دے گئی ہے۔ میری فریاد کو آؤ’۔

میں نے ان کا ہاتھ پکڑا اور کسی طرح انہیں دلدل سے نکالا۔ سردی سے کانپ رہے تھے۔ جب خشکی میں پہنچے تو وہ زمین پر پڑ گئے اور تیز تیز سانسیں لے رہے تھے۔ ان کو دیکھتے ہی مجھے جماران امام بارگاہ کے سپاہی یاد آ گئے۔ میں نے اپنے آپ سے کہا' یہ بھی انہیں میں سے ایک ہیں جیسے بھی ہو انہیں بچانا ہے'۔

انہیں گدھے کے پاس کھینچا۔ موت کے قریب تھے بولے' مجھے کہاں لے جا رہے ہو'؟

میں نے کہا' خاموش رہئے، کچھ بولئے نہیں'۔ انہیں گدھے پر بٹھایا اور سیدھے راستہ کے بجائے ادھر ادھر سے گاؤں پہنچایا۔ اب صبح کی روشنی پھیل ہی رہی تھی، میں گھر کے دروازہ تک جا پہنچا لیکن کسی کو کچھ پتہ نہیں چلا تھا۔ دروازہ کھٹکھٹایا۔ میری بیوی نے آکر دروازہ کھولا اور تعجب سے پوچھنے لگی 'کیا ہوا؟ یہ کسے اپنے ساتھ لائے ہو'؟

میں نے کہا' ان باتوں کا وقت نہیں ہے۔ بچے جاگے ہیں'؟

'نہیں ابھی نہیں جاگے ہیں'۔

'انہیں پتہ نہیں چلنا چاہئے اور ایک کمرہ خالی کر دو'۔

ہمارا ایک کمرہ ہمیشہ خالی ہی رہتا ہے۔ اس برادر کو میں اس کمرہ میں لے گیا اور انہیں عربی لباس لا کر دیا کہ کپڑے بدل لیں اور فوجی لباس اتار دیں۔ کمرہ سے نکلا اور بیوی سے کہا 'جلدی پانی گرم کرو تا کہ خدا کا یہ بندہ کچھ نہا دھو لے'۔

پانی جلدی گرم ہو گیا۔ کمرہ میں میں نے چراغ بھی لا کر جلایا اور پوچھا 'آپ کا نام کیا ہے'؟

'رضا'۔

'یہاں آپ امان میں ہیں رضا صاحب'۔

جب وہ نہا چکے تو میں نے پوچھا 'آپ کے لئے ناشتہ لاؤں'۔

بولے 'میں آنکھیں کھلی نہیں رکھ پا رہا ہوں، سونا چاہتا ہوں'۔

میں نے انہیں بستر بچھا کر دیا اور وہ لیٹتے ہی سو گئے۔ میں باہر نکلا اور کمرہ کو تالا لگا دیا۔ بیوی بڑی صبری سے انتظار کر رہی تھیں۔

'کون ہے یہ'؟

'انقلاب محافظ فوج کا جوان ہے، دلدل میں پھنس گیا تھا'۔

'تو اسے یہاں کیوں لائے ہو؟ اگر پتہ چل گیا نا، تو معلوم ہے ہمارا اور اس کا کیا حال کریں گے'؟

'ہاں پتہ ہے لیکن کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔ اب یہ خیال رکھنا ہے کہ کوئی اسے دیکھ نہ پائے، بچوں کو بھی پتہ نہیں چلنا چاہیئے، کچھ بھی ان سے نہ بتانا۔ ممکن ہے عراقی ان سے اگلوالیں۔ میرے اور تمہارے علاوہ اس کا کسی کو پتہ نہیں چلنا چاہیئے'۔

'ٹھیک ہے'۔

اس دن پھر میں کھیت پر نہیں گیا۔ گھر میں ہی بیٹھا رہا جب دوپہر ہوئی تو بچوں کو کسی بہانہ سے باہر بھیجا اور آہستہ سے اس کمرہ کے پاس پہنچا۔ جب دروازہ کھولا تو دیکھا رضا بہت زیادہ ڈرے سہمے ہیں اور مجھے ایسے دیکھ رہے ہیں کہ جیسے انہیں انتظار تھا کہ میرے ساتھ اور بھی کوئی ہو گا۔

'کیا ہوا؟ ابھی آپ کو مجھ پر اعتماد نہیں ہوا ہے'؟

'نہیں لیکن۔۔۔'۔

'تالا لگانے سے گھبرا گئے ہوں گے اور سوچا ہو گا کہ میں نے آپ کو یہاں قید کر دیا ہے اور اب عراقیوں کو بلانے گیا ہوں'۔

کچھ نہیں بولے۔ میں ان کے پاس بیٹھ کر مسکرایا اور کہا 'برادر عزیز! میں بھی آپ کی طرح ایرانی ہوں'۔ اس کے بعد امام خمینیؒ کی تصویر جیب سے نکالی اور بوسہ لیا یہ دیکھ کر انہیں کچھ اطمئنان ہوتا محسوس ہوا۔

'ہم لوگوں کو حال ہی میں امام سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا ہے'۔

'سچ! وہی جو ریل گاڑی سے گئے تھے'؟

'ہاں'۔

'خدا کا شکر کہ آپ ملے ہیں۔ میں نے خود کو قید ہونے کے لئے تیار کر لیا تھا۔ دلدل میں مرا جا رہا تھا۔ جب آپ کو دیکھا تو سوچا کہ آپ عراقی ہیں اور اپنے آپ سے کہا 'قید غرق ہونے سے بہتر ہے' اور آپ کو مدد کے لئے بلا لیا'۔

ہم دونوں ہنسنے لگے اور میری بیوی سینی میں کھانا لے کر آ گئیں۔ رضا نے کہا 'خدا آپ کو سلامت رکھے، مجھے بہت بھوک لگی تھی'۔

کھانے میں انڈے اور چاول کی روٹی تھی۔ مجھے لگا کہ رضا چاول کی روٹی نہیں کھا پا رہے ہیں شاید عادت نہیں تھی۔ میں نے پوچھا 'آپ کے لئے گندم کی روٹی لے کر آؤں'؟

شرما کے بولے 'گندم کی روٹی بہتر ہے'۔

بیوی گئیں اور گندم کی روٹی اور عربی چائے لے آئیں۔ کھانے کے بعد رضا میں کچھ جان آئی اور میں نے ان کے ساتھ خوب مذاق کئے تا کہ انہیں تنہائی کا احساس نہ ہو۔ آخر میں، میں نے کہا' میں آپ کو قید نہیں ہونے دوں گا چاہے میری جان چلی جائے'۔

'خدا آپ کے حوصلے بلند رکھے'۔

'رضا صاحب! امام رضاؑ کی مدد سے ہم آپ کو کسی طرح سے یہاں سے نکال دیں گے اور آپ اپنی منزل پر پہنچ جائیں گے۔فی الحال بس اپنا خیال رکھئے۔ میں دن میں دو تین بار آکر آپ کا حال دریافت کروں گا۔ میرے اور میری بیوی کے علاوہ کسی کو نہیں پتہ کہ آپ یہاں ہیں'۔

'کوئی بات نہیں صبر کروں گا'۔

'ایک ریڈیو بھی آپ کو لا کر دیتا ہوں تا کہ بور نہ ہوں اور جنگ کی خبریں بھی سنتے رہیں'۔

کمرہ کو پھر تالا لگایا اور پھر مغرب کے وقت میں ریڈیو اور کھانا لے کر آیا۔ کھانے کے بعد میں نے پوچھا 'رضا صاحب! آپ وہاں دلدل میں کیسے پھنسے تھے'؟

'میں راستہ کھو گیا تھا۔ ہمارا چھوٹا سا آپریشن تھا اوراس میں، میں ساتھیوں سے الگ ہو گیا۔ سوچا ہیڈ کوارٹر واپس چلا جاؤں لیکن پتہ چلا کہ میں عراقیوں کی طرف جارہاہوں۔ واپس ہوااور واپسی میں ہی دلدل میں پھنس گیا'۔

حاجی کی کہانی یہاں تک پہنچی تھی کہ میں نے حسن پر ایک نظر ڈالی اور سوچا کہ اگر وہ نہ ہوتے تو یقیناً ہم بھی کئی بار گم ہوتے۔ شاید اس گروہ میں جس میں رضا تھے کوئی حسن یا پیرزادہ نہیں تھا یا شاید رضا اپنی غلطی سے گم ہوئے تھے۔

حاجی طاہر کی گفتگو جاری تھی 'رضا صاحب کچھ دن ہمارے گھر رہے۔ میں ہر دن کمرہ کے دروازہ کو باہر سے تالا لگا کر کھیت پر چلا جاتا تھا اور صبح اور شام کو ان کے پاس جاتا اور کھانا پہنچاتا تھا۔ ہماری دوستی ہو گئی تھی اور اب رضا ہمارے گھر کی ہی ایک فرد تھے۔

ایک شام جب میں تالا کھولنے لگا تو ریڈیو کی آواز سنائی دی۔ اپنے آپ سے کہا 'تعجب ہے۔ رضا صاحب اتنی بے احتیاطی کر رہے ہیں، ریڈیو کی آواز اتنی اونچی کیوں کر رکھی ہے؟ انہیں نہیں معلوم کہ یہ کام خطرناک ہے'؟

انہیں سمجھانے کا سوچا اور تالا کھول کر اندر داخل ہوا۔ دیکھا ریڈیو تو اپنی جگہ طاق میں رکھا ہوا ہے، آن بھی نہیں کیا گیا ہے۔ تعجب ہوا تو پھر یہ آواز کہاں سے آرہی تھی؟ رضا کو غور سے دیکھا۔

'رضا صاحب آپ مجھ سے کچھ چھپا رہے ہیں'؟

مجبوراً انہیں اعتراف کرنا پڑا 'ہاں میرے پاس ایک چھوٹا سا وائرلیس سیٹ ہے۔ میں نے ساتھیوں کی گفتگو سننے کے لئے آن کیا تھا'۔

میں نے سکون کی سانس لی اور کہا 'وہ تو ٹھیک ہے لیکن احتیاط کیجیئے۔ اگر پتہ چل گیا کہ آپ یہاں ہیں تو ٹینک سے اس گھر کو تباہ کر دیں گے۔ ہم لوگوں کو بھی مار ڈالیں گے اور میرے بیوی بچوں کو بھی'۔

'ٹھیک ہے اب احتیاط کروں گا'۔

ان دنوں وقتاً فوقتاً کوئی گاؤں والا عراقیوں کا محاصرہ توڑ کر بھاگ جاتا تھا۔ اتفاق سے اگلے دن میرا اپنا بھائی جس پر عراقیوں کو شک ہو گیا تھا بستان بھاگ گیا، 'گر' نامی گاؤں چلا گیا۔ عراقیوں کو بہت جلد اس کے بھاگنے کا پتہ چل گیا، اس کے گھر پر ٹوٹ پڑے اور سب کچھ تہس نہس کر دیا اس کے بعد ہمارے گھر کی طرف آنے لگے۔ میں نے سوچا اب ہمارا کام بھی تمام ہے، سخت ڈر گیا تھا۔ اپنے آپ سے کہا 'اب پورا گاؤں تباہ کر دیں گے'۔

امام رضاؑ اور امام خمینیؒ سے توسل کیا 'اس سپاہی کے صدقہ میں اسے اور ہمیں بچا لیجئے'۔ وہ دروازہ پر پہنچ چکے تھے، میں نے خود کو مطمئن رکھنے کی کوشش کی اور آرام سے دروازہ کھولا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ فوجی گاڑیاں اور اسلحوں سے لیس فوجی کھڑے ہیں۔

'کیا ہوا'؟

مجھے ایک طرف دھکا دیا اور گھر میں گھس گئے۔ کمانڈر عربی میں چلایا 'تمہارا بھائی کہاں ہے'؟

'مجھے نہیں معلوم'۔

اس نے کہا' جھوٹ بول رہے ہو' اور اپنے سپاہیوں کو ہر جگہ تلاشی لینے کا اشارہ کیا۔ میں بہت ڈر گیا، کوئی راہ فرار نظر نہیں آرہی تھی۔ سب سے پہلے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے وہاں میرے بھائی کی کتابیں؛ مفاتیح الجنان اور مقتل وغیرہ تھیں۔

کمانڈر نے پوچھا' یہ کیا ہے'؟

میں نے کہا' یہ ہمارے والد کی میراث ہے، ان کی یادگار ہے اس لئے یہاں رکھی ہوئی ہیں'۔

کچھ نہیں بولا اور اس کے بعد اس کمرہ میں داخل ہوئے جس میں میرے بیوی بچے تھے۔ انہیں کمرہ سے نکالا اور تلاشی لینے لگے۔ اور اب باری تھی اس کمرہ کی جس میں، میں نے رضا کو چھپا رکھا تھا۔ اب میں دعا کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ کمرہ کا دروازہ مقفل تھا۔

'یہاں کیا ہے'؟

'سر! یہ کمرہ ہم استعمال نہیں کرتے، غیر آباد سا ہے۔ ہم یہاں فضول سامان اور جانوروں کا چارہ رکھتے ہیں'۔

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا اور یہ ظاہر کرنے کے لئے میں چابھی ڈھونڈھ رہا ہوں جیبیں ٹٹولنے لگا تا کہ اسے کسی طرح کا شک نہ ہو۔

'ابھی کھولتا ہوں'۔

'ضرورت نہیں ہے لیکن اگر پتہ چلا کہ تم نے اپنے بھائی کو بھگایا ہے تو بہت برا ہو گا'۔

'میری طرف سے آپ مطمئن رہئے'۔

آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا لیکن وہ لوگ واپس جارہے تھے۔ اس وقت میں نے صرف ائمہ طاہرینؑ سے لو لگائی تھی۔ جب دیکھا کہ اس طرح انہوں نے مجھے بچالیا ہے تو اس کے بعد سے ڈرنا چھوڑ دیا۔

بیوی کی حالت غیر تھی، انہوں نے بھی خود کو مرنے کے لئے تیار کر لیا تھا۔

جب عراقی چلے گئے تو میں ان سے کہا ،'بچوں کو کہیں مصروف کر دو'۔

میں پہنچا رضا صاحب کے پاس ،'آپ کو پتہ چلا کیا ہوا ہے'؟

'ہاں! میں نے سب اپنے کانوں سے سنا۔ خدا نے بچایا ہے ہم سب کو'۔

'خاطر جمع رکھئے کہ اس کے بعد سے آپ ہر خطرہ سے بچ نکلیں گے اس لئے کہ اس سے بڑا کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا تھا'۔

اس کے کئی دن بعد تک رضا صاحب ہمارے گھر میں رہے اور آخر کار پڑے پڑے اکتا گئے۔ ایک دن کہنے لگے ،'کسی طرح مجھے یہاں سے نکالئے۔ بس گاؤں سے باہر نکال دیجئے اور بتا دیجئے کس سمت جانا ہے باقی میرے اوپر'۔

'رضا صاحب مجھے بھی پریشانی ہو رہی ہے۔ یہ صورتحال زیادہ دن نہیں چل سکتی۔ میں بھی آپ کو بھیجنا چاہتا ہوں لیکن سمجھ میں نہیں آرہا کہ کیسے کیا کروں۔ گاؤں محاصرہ میں ہے صرف پل پر سے گذرا جا سکتا ہے لیکن اس پر بھی سنتری کھڑا کر رکھا ہے'۔

'یعنی وہاں سے گذرا نہیں جاسکتا'؟

'فی الحال تو ایسا ہی لگ رہا ہے'۔

'کوشش کیجئے کوئی نہ کوئی راستہ نکلے گا'۔

ان کا اصرار دیکھ کر میں نے بھی طے کر لیا کی کوئی نہ کوئی راستہ نکالنا ہے۔ گاؤں کے ارد گرد کا جائزہ لیا، کوئی فائدہ نہ تھا۔ شارٹ کٹ بھی ممکن نہیں تھا بس پل ہی سے گذرا جاسکتا تھا۔

رات میں تھکا اور ناامید رضا کے پاس پہنچا۔ انہوں نے پوچھا 'کیا ہوا؟ کوئی راستہ نکلا'؟

'نہیں، فقط پل پر ہی سے گذرنا ہو گا'۔

'تو کوشش نہیں کی جاسکتی'؟

'نہیں! خطرہ ہے'۔

'تو آپ لوگ وہاں سے کیسے گذرتے ہیں'؟

'ایک تو یہ کہ ہم لوگوں کو تقریباً جانتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ ہماری اور ان کی زبان ایک ہے آپس میں عربی میں بات کرتے ہیں۔ اگر آپ سے کچھ پوچھا تو آپ کیا کہیں گے'؟

'لیکن مجھے ڈر ہے کہ یہاں کہیں پھنس نہ جاؤں اور آپ اور آپ کے بیوی بچوں کے لئے مصیبت بن جاؤں۔ سب سے زیادہ مجھے یہ سوچ کر تکلیف ہو رہی ہے'۔

میں نے کچھ دیر سوچا اور اچانک میرے ذہن میں ایک بات آئی 'آپ گونگے بن سکتے ہیں'؟

انہوں نے تعجب سے مجھے دیکھا اور بولے 'ہاں'

'فقط ایک ہی راستہ ہے کہ گونگے ہو جایئے اور اگر عراقی کچھ پوچھیں تو کچھ نہ بولیئے'۔

'انہیں شک نہیں ہو گا'؟

'توکل بر خدا! میں ان سے کہوں گا کہ آپ میرے بھائی ہیں اور بول نہیں سکتے'۔

'پوچھیں گے نہیں کہ تمہارا یہ بھائی اب تک کہاں تھا'؟

'کہوں گا مریض تھا'۔

آخر کار رضا صاحب نے یہ منصوبہ مان لیا۔ میں نے کہا 'تو پھر ایسا ہے کہ اپنی وضع قطع بدل لیجئے، اس داڑھی کے ساتھ ایسے ہی آپ پر شک ہو گا'۔مان گئے۔ میں سامان لایا اور انہوں شیو بنالی۔ اہلیہ سے بھی میں نے بتا دیا کہ ہم اس طرح پل سے گذرنا چاہتے ہیں وہ بھی رضا بھائی سے مانوس ہو گئیں تھیں۔اور اب وہ رخصت ہونے کی رات تھی۔ میں میری بیوی ان کے کمرہ میں آئے تو ہم دونوں کو رونے آگیا، رضا صاحب بھی رونے لگے۔

جب امام سے ملاقات کے لئے تہران گئے تھے تو میں نے وہاں سے ایک جوڑ جوتے خریدے تھے لیکن ابھی پہنے نہیں تھے۔میں نے وہ لا کر رضا کو دیے اور کہا کہ کل یہ پہن لیجئے گا۔

'کل شاید میری زندگی کا آخری دن ہو۔ آپ لوگ مجھے معاف کر دیجئے گا'۔

'انشاء اللہ کچھ نہیں ہو گا'۔

نصف شب کے بعد تک بیٹھے باتیں کرتے رہے اس کے بعد میں نے کہا 'بہتر ہے تھوڑا آرام کر لیجئے'۔

اس رات ایک دو گھنٹے سے زیادہ نہیں سوئے۔ صبح میں گدھے کو صحن میں لے کر آیا اس پر چمڑے کا تھیلا ڈالا اور رضا صاحب کا وائرلیس سیٹ اس کے ایک طرف ڈال دیا۔ ابھی پوری طرح روشنی نہیں ہوئی تھی۔ کوئی ہماری طرف متوجہ نہ ہو اس لئے میں بھی گدھے پر بیٹھا اور رضا صاحب کو بھی پیچھے بٹھایا۔ گلیاں ہمیشہ کی طرح سنسان تھیں۔

پل کے نزدیک پہنچ کر میں نے کہا 'رضا صاحب یاد رہے آپ گونگے ہیں'۔

'ٹھیک ہے'۔

'نارمل اور مطمئن رہئے گا۔ اگر اچانک ڈر گئے تو انہیں شک ہو جائے گا اور پھر ہمارا کام تمام ہے'۔

'کوشش کروں گا'۔

'یہ سنتری مجھے جانتا ہے۔ میں روز اسی راستے سے آتا جاتا ہوں اور اب میری تلاشی بھی نہیں لیتا'۔

'خدا کرے کوئی مشکل کھڑی نہ ہو'۔

جوں جوں ہم پوسٹ کے پاس پہنچ رہے تھے میرے حوصلے جواب دیتے جا رہے تھے۔ بس گویا گدھے کا سر جھکا کر گھر کی طرف بھاگنا ہی چاہتا تھا۔ پہلے یہ کام اتنا سخت نہیں لگ رہا تھا میں سوچ رہا تھا کہ میں اپنے اوپر قابو رکھوں گا اور بہت آرام سے نکل جائیں گے لیکن جب پوسٹ کے بالکل سامنے پہنچ گیا تھا تو اب احساس ہو رہا تھا کہ میں نے کتنا خطرناک کھیل شروع کیا تھا۔

ہر روز جب سنتری مجھے دیکھتا تھا تو گذر جانے کا اشارہ کرتا تھا، سامنے بھی نہیں آتا تھا۔ یہ اس کا معمول تھا وہ روزانہ اس وقت مجھے وہاں سے گذرتے اور کھیت

جاتے دیکھتا تھا۔ لیکن آج میں اکیلا نہیں تھا لہذا جیسا کہ میں پہلے ہی سوچ رہا تھا اس نے مجھے بلالیا۔ میں فوراً گدھے سے اترا اور سنتری کی طرف آگے بڑھا اور نزدیک پہنچ کر کہا' سلام علیکم! کیا حال ہے آپ کا؟ آپ ٹھیک ہیں'؟

میں جتنا بولے جارہا تھا اتنا ہی اس کی توجہ رضا صاحب کی طرف تھی۔

'یہ اپنے ساتھ کسے لے جارہے ہو'؟

میں رضا صاحب کی طرف پلٹا تو دیکھا کہ نارمل ہیں اور آرام سے سنتری کی طرف دیکھ رہے ہیں لہذا جواب دیا' میرے بھائی کا پوچھ رہے ہیں'؟

'تمہارا بھائی! پہلے تو نہیں دکھائی دیا، روز تو اکیلے کھیت جاتے تھے'۔

'بیمار اور گھر میں پڑا تھا، اس وقت بھی کی اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے'۔

'اگر طبیعت ٹھیک نہیں ہے تو اسے کام پر کیوں لے جارہے ہو'؟

'کام نہیں کرے گا، تھوڑا کھلی فضا میں رہے گا تا کہ طبیعت کچھ بہتر ہو جائے'۔

'کیا بیماری ہے اسے'؟

'اعصابی مریض ہے'۔

'ہماری طرف گھور کے کیوں دیکھ رہا ہے؟ کچھ بول کیوں نہیں رہا'؟

'گونگا ہے بیچارہ بول نہیں سکتا'۔

سنتری رضا صاحب کی طرف بڑھا اور میں نے ائمہ سے توسل کرنا شروع کر دیا۔

اس نے غور سے ان کا چہرہ دیکھا اور اس کے بعد پوچھنے لگا 'سچ ہے تم بول نہیں سکتے'؟

رضا صاحب خالی مسکرائے البتہ اسے شک ہو گیا تھا۔ کچھ دیر گدھے کو گھوم گھوم کے اور ہمیں غور سے دیکھتا رہا۔ اس کے بعد بولا 'ٹھیک ہے جاؤ'۔

ہم چلنے لگے۔ میں ڈر رہا تھا کہ کہیں پلٹ کر نہ دیکھ لو اس لئے کہ ہو سکتا ہے اس کی رائے بدل جائے اور ہمیں واپس بلا لے۔ رضا صاحب کہنے لگے 'نکل آئے ہیں'۔

میں نے کہا‘کچھ مت بولئے’۔

ہم پانچ سو میٹر پل سے آگے آ چکے تھے لیکن ابھی بھی ڈر لگ رہا تھا۔ بہر حال کسی طرح کھیت پر پہنچے اور وہاں پہنچ کر ہی میں اطمئنان کی سانس لے سکا۔ خوشی سے ہم ایک دوسرے کے بغلگیر ہو گئے۔ اس کے بعد رضا صاحب کہنے لگے ‘راستہ دکھاؤ مجھے جلدی چلنا چاہئے’۔

راستہ دکھایا اور مذاق میں کہا‘خیال رکھئے گا اب کہ دلدل میں نہ پھنسئے گا’۔ وہ ہنس کے جیسے ہی جانے کے لئے مڑے تو دیکھا کہ کچھ عراقی فوجی ہماری طرف چلے آرہے ہیں۔ دل منہ کو آگیا زبان سے بے ساختہ نکلا‘یا ابا الفضل’!

میں نے سوچا ہمارا پتہ چل گیا ہے اور اب یہ ہمیں گرفتار کرنے آرہے ہیں۔ پریشان لگ رہے تھے اور عجیب بات یہ تھی کہ گاؤں کی طرف سے نہیں آرہے تھے۔ کوئی امید تو اگرچہ بچنے کی اب نہیں تھی لیکن پھر بھی میں نے سوچا کہ رضا صاحب کو کہیں چھپا دوں لہٰذا ان سے کہا‘جلدی سے نہر میں

لیٹ جایئے'۔ ہماری کھیت کے قریب ایک خشک نہر تھی وہیں انہیں لیٹنے کے لئے کہا۔

وہ لیٹ گئے اور میں نے انہیں گھاس پھوس سے ڈھانپ دیا۔ فوجی پہنچ چکے تھے۔

تھکے ماندے لگ رہے تھے۔ ہونٹ خشک تھے اور وردی بھی مٹی سے اٹی اور پھٹی تھی۔ بہرحال انہوں نے ہمارے خیال کے برعکس رضا صاحب کا نہیں پوچھا اور صرف پانی ڈھونڈھ رہے تھے، پیاسے تھے۔ میرے پاس جو پانی تھا میں نے انہیں دیا اور پوچھا 'کیا ہوا ہے'؟

'کل رات ایرانیوں نے حملہ کیا جس کے نتیجہ میں ہم صحرا میں بکھر گئے ہیں۔ برا حال ہو چکا ہے۔ ہماری افواج یہاں سب سے نزدیک کہاں ہیں'؟

'رفیع گاؤں کی طرف جایئے'۔

وہ چلے گئے اور مجھے بعد پتہ چلا کہ نہر نیسان کے اطراف میں ہونے والے آپریشن نے ان کا یہ حال کیا ہے۔

دوبارہ رضا صاحب کے پاس پہنچا، بولے 'پھر خیریت رہی'۔

'خدا ہمارے ساتھ ہے، مجھے یقین ہے'۔

'میں اب جارہا ہوں'۔

'آپ بردیہ گاؤں کی طرف جایئے وہاں سے آسانی سے راستہ مل جائے گا'۔

ہم پھر ایک دوسرے کے بغلگیر ہوئے اور دونوں کی آنکھوں سے آنسو چھلک آئے اور ان کی وجہ خوشی بھی تھی اور جدائی کا غم بھی۔ وہ میری زندگی کا ایک بہترین دن تھا'۔

حاجی طاہر نے جب یہ واقعہ بیان کیا تو ہماری وہ رات بھی تاریخی ہو گئی جو کبھی نہ بھولے گی۔ ہماری راتیں ایسے ہی گذرتی تھیں۔ اگر ان راتوں کے سارے واقعات لکھنے بیٹھ جاؤں تو اس کے لئے مزید کئے صفحات سیاہ کرنا ہوں گے۔ بس اتنا یاد رکھئے کہ ان راتوں میں ہم نے عراقیوں کو لمحہ بھر کے لئے آرام سے نہیں بیٹھنے دیا اور دلچسپ یہ کہ ہم میں سے کوئی زخمی تک نہیں ہوا۔ حسین اتنی بہترین منصوبہ بندی کرتے تھے کہ ہم ایک بار بھی عراقیوں

کی گھات میں نہ آئے۔ ہماری ٹکڑی بیس یا تیس سپاہیوں پر مشتمل ہوتی تھی اور اگر کوئی جگہ اجنبی ہوتی یا وہاں بارودی سرنگ نصب ہونے کا خطرہ ہوتا تو حسین، حسن کو لے کر پہلے خود جا کر جائزہ لیتے تھے اور بعض دفعہ دن میں یہ کام کر لیتے تھے۔ اس دوران حسن کو ایک لقب بھی دے دیا گیا تھا۔ سب انہیں قطب نما کہتے تھے لیکن یہ لقب ان کی صلاحیتیں بیان کرنے کے لئے ناکافی تھا اس لئے کہ کوئی بھی قطب نما اس انداز سے کسی کو اس کی منزل تک نہیں پہنچا سکتی جس طرح حسن ہم لوگوں کو پہنچاتے تھے۔

ایک رات ہم بارودی سرنگیں نصب کرنے کے لئے جفیر روڈ کی طرف گئے۔ یہ علاقہ ہویزہ کے جنوب میں واقع تھا۔ عراقی ہور الہویزہ کی طرف سے آسانی سے وہاں پہنچ سکتے تھے اور انہیں روکنا بہت مشکل تھا۔ جفیر میں ان کی موجودگی سے اہواز سے خرم شہر جانے والی سڑک اور ہویزہ شہر غیر محفوظ ہو جاتا۔ عراقیوں نے یہاں ریت سے ایک راستہ بنا رکھا تھا جو شلمچہ تک جاتا تھا۔

حسین کہنے لگے 'آج رات کا آپریشن سخت ہو گا، ہمیں خود کو جفیر روڈ پر پہنچانا ہے'۔

رات اندھیری تھی تھوڑے فاصلہ پر بھی کچھ دیکھنا ممکن نہیں تھا۔

روڈ پر عراقی قابض تھے لہٰذا اس سے تو جایا نہیں جاسکتا تھا چنانچہ مجبوراً اِدھر اُدھر سے گھوم کے جانا پڑ رہا تھا۔ ہم نے اپنا اپنا سامان اٹھایا جو کہ حسب معمول بھاری تھا اور پیدل چلنا شروع کر دیا۔ چار گھنٹے چلنے کے بعد احساس ہوا کہ اس سے آگے نہیں جاسکتے۔ مطلع ابر آلود تھا، ستارے بھی نظر نہیں آرہے تھے کہ ان کی مدد سے سمت کا پتہ لگایا جاتا کہ ہمیں کہاں اور کس طرف جانا ہے۔ حسن خاموش تھے، ان کی خاموشی پر ہم کو کچھ شک ہونے لگا اور جب کافی دیر خاموش رہے تو ہم سے رہا نہ گیا اور پوچھ بیٹھے 'حسن! ہم لوگ کھو تو نہیں گئے ہیں'؟

'نہیں'۔

'یقین ہے آپ کو'؟

'ہاں'۔

'تو پھر پہنچ کیوں نہیں رہے ہیں'؟

'جلدی نہ کیجئے، پہنچ جائیں گے'۔

مجھے ایسالگ رہاتھا کہ ہم اپنے ہی گرد گھوم رہے ہیں، اپنے آپ سے کہا'ہم یقیناً کھو چکے ہیں لیکن حسن ہمیں یہ بتانے میں شرمارہے ہیں'۔

اگر ایسا ہے تو ہمیں صبح ہونے سے پہلے پہلے واپس پہنچنا ہے نہیں تو عراقیوں سے مڈ بھیڑ ہو سکتی ہے۔ لیکن جب منزل پر پہنچے تو سب کو یقین آیا کہ حسن صحیح کہہ رہے تھے اور ہم لوگ کھوئے نہیں تھے۔ اس رات ہمیں پتہ چلا کہ حسن کو ستاروں کی بھی ضرورت نہیں ہے۔

ایک بارودی سرنگ نصب کرنے کے بعد کندھوں سے اٹھارہ کلو بوجھ کم ہو رہا تھا اور ہم بہت خوش ہو رہے تھے اور یہ سوچ کر خوشی دوبالا ہو رہی تھی کہ ہر بارودی سرنگ دشمن کا بھاری نقصان کرے گی۔ کام ختم کر کے جب ہم نے واپسی کی راہ لی تو میں اتنا تھک چکا تھا کہ چلتے چلتے سو گیا۔ اسی دوران مجھے حسین

یاد آئے۔ ان کا جسم تو جیسے فولاد کا بنا تھا، تھکن کا جیسے ان پر کوئی اثر ہی نہیں ہوتا تھا اور یہ بھی میں جانتا تھا کہ واپس منزل پر پہنچنے کے بعد وہ سونے کے بجائے نمازِ شب کے لئے کھڑے ہو جائیں گے۔۔۔

اس دور کے واقعات یاد کر کے مجھے خوشی بھی ہوتی ہے اور غم بھی۔ ہویزہ شہر تقریباً ہر طرف سے دشمن کے محاصرہ میں تھا وہ ٹینک اور گاڑیوں کے ساتھ بھی تھے اور پیدل بھی۔ شہر کی سڑکوں اور گھروں پر مستقل توپ اور مارٹر سے فائرنگ کی جا رہی تھی۔ چذابہ درہ سے داخل ہو کر دشمن بستان کی طرف سے نہر نیسان تک پہنچ گیا تھا۔ اور اب اس کے ٹینک سوسنگرد اور اہواز پہنچنا چاہتے تھے۔ ہویزہ سے تین کلو میٹر کے فاصلہ پر مورچہ زن تھے اور ہم سے زیادہ شہر کے اطراف پر قابض تھے۔ ان حالات میں کام کرنا بہت سخت تھا لیکن حسین کو سختیوں کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ واپسی پر انہوں نے دل کا حال یوں سنانا شروع کیا:

'خدا کرے ہماری ان کوششوں کے نتیجہ میں، ہم نے علاقہ کی عسکری شناخت بھی حاصل کی ہے اور دشمن پر شب خون بھی مارے ہیں، حکام ہویزہ کو اہمیت دیں۔ سب پر یہ ثابت ہونا چاہئے کہ یہاں بھی مزاحمت کا ایک مرکز قائم ہو چکا ہے۔ اس طرح دشمن دفاع پر مجبور ہو گا اور کسی حد تک الجھا رہے گا'۔

میں نے کہا 'اس کا کیا فائدہ ہے'؟

جواب ملا 'اس کا فائدہ یہ ہو گا کہ دیگر جگہوں کی افواج کو بہتر طور پر کام کرنے کا موقع ملے گا۔ اس کے علاوہ فوج اس علاقہ میں آپریشن کا ارادہ رکھتی ہے۔ وہ علاقہ سے نابلد ہیں لہٰذا بہت زیادہ امکان ہے کہ انٹیلیجنس کا سارا کام ہمارے ذمہ ہو گا'۔

قدوسی نے پوچھا 'یہ آپریشن کب ہونا ہے'؟

حسین نے جواب دیا 'انہیں دنوں میں'۔

میں نے کہا 'تو ہمیں علاقہ کی شناخت کا کام مکمل کر لینا چاہئے'۔

جواب ملا 'بالکل '۔

پھر میں نے پوچھا 'فوج کی توپوں کا کیا ہوا '؟

انہوں نے بتایا 'ہویزہ کے اطراف میں نصب ہیں، وہ کام ختم ہو چکا ہے '۔

کچھ دن پہلے انہیں اہواز بلایا گیا تھا جب واپس آئے تو بہت پریشان تھے۔ میں نے پوچھا 'کیا ہوا اسید '؟

کہنے لگے 'مجھ پر بہت زیادہ دباؤ ڈالا گیا کہ ہویزہ سے نکل آؤں '۔

'تو آپ نے کیا کہا '؟

'کوئی چارہ نہیں تھا، ماننا پڑا '۔

'تو پھر ہمیں یہاں سے چلنا چاہیے '؟

'ہاں '۔

'چلیں گے کہاں '؟

'سوسنگرد'۔

'یعنی عقب نشینی'؟

'ہاں'۔

'اس سے جوانوں کے حوصلے پست ہو جائیں گے'۔

'کوئی چارہ تو ہے نہیں'۔

بہرحال ہم بادل نخواستہ چلنے کے لئے تیار ہو گئے۔ حسین بولے 'ہویزہ چھوڑنا میرے لئے سخت ہے اور وہ بھی ایسے وقت میں جب ہماری دشمن سے کوئی خاص جھڑپ نہیں ہوئی ہے'۔

میں نے کہا 'اگر ایسا ہے تو رک جاتے ہیں'۔

جواب دیا 'نہیں، حکم پر عمل ضروری ہے۔ سامان اکٹھا کرو'۔

ہم تیار ہو رہے تھے۔ حسین بہت پریشان تھے۔ اپنی کرسی پر بیٹھ کر خط لکھنے لگے۔

'کس کے پاس خط لکھ رہے ہیں'؟

'اعلیٰ دفاعی کونسل میں امام خمینیؒ کے نمائندہ کے پاس۔ علاقہ کی صورتحال اور ہویزہ کی اسٹریٹیجک اہمیت واضح کی ہے۔ میرے خیال میں ہویزہ کو چھوڑنا صحیح نہیں ہے'۔

'یعنی آپ نے ان سے افواج یہی رہنے دینے کی درخواست کی ہے'؟

'ہاں! اسی لئے رحیم موسوی اور دو دیگر جوانوں کو یہیں رہنے دیں گے، ہمارا ٹھکانہ محفوظ رہنا چاہئے، ہویزہ کو ہاتھ سے نہیں نکلنے دینا ہے'۔

اسی دن ہم سوسنگرد کی طرف روانہ ہوگئے۔ لیکن وہاں پہنچتے ہی تین ساتھی زخمی ہوگئے۔ عراقیوں کی فائرنگ ایک لمحہ کے لئے بھی بند نہیں ہورہی تھی۔

حسین نے کئی جگہوں پر فون کئے اور آخر کار خوشی سے کہنے لگے 'کل ہویزہ لوٹ چلیں گے'۔

ہم جو وہاں سے آنے کے لئے مشکل سے تیار ہوئے تھے یہ خبر سن کر خوشی سے پھولے نہیں سمارہے تھے۔ حسین نے مزید بتایا'صرف اتنا ہی نہیں بلکہ فوج کی توپیں اور مسلح جوان بھی سوسنگرد اور ہویزہ میں نصب اور تعینات ہوں گے'۔

اس طرح ہم ہویزہ لوٹ آئے اور اپنا کام پھر سے شروع کر دیا۔ حسن، حاجی شویش کے ساتھ ہر صبح علاقہ کی شناخت کے لئے جاتے اور رات میں ہمیں بارودی سرنگ نصب کرنے کے لئے لے جاتے۔بارودی سرنگیں کہاں لگانی ہیں اس کا تعین انقلاب محافظ فوج کے شعبہ انہدامی تربیت کے سربراہ جو کہ اس وقت حسن رکابی تھے کے ذمہ تھا اور ان کی تشخیص درست ثابت ہوتی تھی۔

ہویزہ میں فوج کی توپیں نصب ہو جانے کے بعد ہماری حالت کچھ بہتر ہو گئی۔ اب ہم دشمن کے ٹھکانوں کو نشانہ بنا سکتے تھے۔دن رات میں کئی بار توپوں کی

آوازیں آتیں اور گولے غراتے فضا کی خاموشی توڑتے ہمارے سروں سے گذر جاتے تھے اور ہم اپنی مسکراہٹ روک نہیں پاتے تھے۔

'یہ اپنی توپ کی آواز ہے سنائی دے رہی ہے'؟

'لگتا ہے ہماری تنہائی دور ہوتی جارہی ہے'۔

'یعنی دشمن کو پیچھے ڈھکیلا جاسکتا ہے'؟

'کیوں نہیں ڈھکیلا جاسکتا، جس آپریشن کا کہہ رہے ہیں شروع ہونے دیجئے پھر دیکھتے ہیں'۔

حسین سب سے زیادہ خوش تھے۔

'جس مزاحمتی مرکز کی میں بات کر رہا تھا لگتا ہے اب قائم ہوتا جارہا ہے'۔

'لگتا ہے خامنہ ای صاحب کے پاس آپ کے خط نے کام کر دکھایا ہے'۔

'اور اچھے دنوں کا انتظار کیجئے'۔

'ہر گولہ یہاں کے باشندگان کی ڈھارس باندھتا ہے اور اب سمجھ رہے ہیں کہ ان کا دفاع باقاعدہ کیا جارہا ہے'۔

'ایک مسئلہ ہو سکتا ہے'؟

'کیا مسئلہ'؟

'فوج علاقہ سے آشنا نہیں ہے لہٰذا پتہ نہیں گولے نشانہ پر لگ رہے ہیں یا نہیں'۔

'کاش ہم اپنے تجربات سے انہیں مستفید کر سکتے'۔

یہ تمنا جلد ہی پوری ہو گئی۔ اگلی ہی صبح ایک فوجی جیپ اسکول کے صدر دروازہ پر آن پہنچی۔ گاڑی میں ایک کانسٹبل اور ایک لفٹننٹ سوار تھے۔

لفٹننٹ نے پوچھا 'علم الہدیٰ صاحب ہیں'؟

'جی'۔

اور انہیں حسین کا کمرہ دکھا دیا۔ لفٹننٹ پرعزم نظر آرہے تھے، ان کی آنکھوں میں ایک خاص سنجیدگی اور ہمت تھی۔ اس سے قبل کبھی کوئی فوجی ہم سے ملنے نہیں آیا تھا۔ میں نے اپنے آپ سے کہا 'یہ کون سا لفٹننٹ ہے؟ اسے حسین سے کیا کام ہے؟ کیا کچھ بتانے آیا ہے؟ کہیں کوئی آپریشن تو نہیں شروع ہونے والا اور اسے ہمیں اعتماد میں لینے کے لئے بھیجا گیا ہو'؟

ایک گھنٹہ تک لفٹننٹ اور حسین میں گفتگو ہوتی رہی۔ اس کے بعد حسین کمرہ سے نکلے اور مجھے بلایا۔

'علی یہاں آیئے'۔

میں ان کے پاس پہنچا بہت خوش تھے۔

'خیریت تو ہے'؟

'ہاں خیریت ہے'۔

میں ان کی طرف دیکھنے لگا کہ کچھ کہیں۔ بولے 'غفار درویشی کہاں ہیں'؟

'ادھر ہی کہیں ہوں گے'۔

'انہیں ساتھ لے کر میرے کمرہ میں آیئے'۔

'ہوا کیا ہے'؟

'ابھی پتہ چل جائے گا'۔

فوراً میں نے غفار درویشی کو ڈھونڈھا اور ان سے کہا' آؤ سید کو ہم لوگوں سے کچھ کام ہے'۔

ہم دونوں حسین کی خدمت میں حاضر ہوئے، انہوں نے ہمیں ایک کونہ میں لے جاکر کہا' یہ فوجی بھائی ہم سے مدد لینے کے لئے ہمارے پاس آئے ہیں'۔

'مدد لینے کے لئے؟ کیسی مدد لینے کے لئے'؟

'یہ توپ خانہ کے اشارہ کار ہیں۔ انہیں ایک رہنما اور مددگار کی ضرورت ہے۔ انہیں ایسا آدمی چاہیئے جو علاقہ کو خوب جانتا ہو اور انہیں بتا سکے کہ کس

جگہ کو ٹھکانہ بنایا جائے۔ آپ لوگ علاقہ کو اچھی طرح جانتے ہیں جایئے ان کی مدد کیجئے'۔

حسین کی آواز میں ایک جوش سا تھا اور میرے اور غفار دونوں کے منہ سے نکلا 'بسر و چشم'۔

انہوں نے مزید کہا 'ہمیں اچھا موقع ملا ہے، دشمن کو نقصان پہنچانے کے لئے اس موقع کا بھرپور فائدہ اٹھایئے۔ اس برادر کو ایسی جگہ لے کر جایئے جہاں سے سب سے بہتر دکھائی دیتا ہو'۔

'آپ خاطر جمع رکھئے'۔

اس کے بعد ہم لوگ اس کمرہ میں گئے جہاں لفٹننٹ بیٹھے ہوئے تھے۔ حسین نے ہمارا تعارف کراتے ہوئے کہا 'یہ دو برادر آپ کی مدد کریں گے'۔

لفٹننٹ آرام سے آگے بڑھے اور ہم سے ہاتھ ملایا۔ حسین تو اتنا پرجوش تھے جیسے خود دشمن سے جنگ کر رہے ہوں۔

’آپ لوگ دکھا دیجئے کہ آپ لوگوں کی جانب سے علاقہ کی شناخت کا کام بے بنیاد نہیں تھا۔ دشمن کو تتر بتر کر دیجئے، عراقیوں پر ایسا وار کیجئے کہ انہیں چھٹی دودھ یاد آجائے‘۔

ہم جیپ میں بیٹھے اور کرخہ کور کی طرف چل دیے۔ لفٹننٹ بولے ’ہم یہاں حال میں ہی آئے ہیں۔ ابھی تک پتہ نہیں لگا سکے کہ درست کس جگہ کا نشانہ لینا ہے۔ دشمن کی طرف غیر منظم طریقہ سے فائر تو کرتے ہیں لیکن اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اور دوسری بات یہ کہ آپ لوگ جیسا کہ جانتے ہیں دشمن نے اس علاقہ میں کوئی پشتہ نہیں قائم کیا ہے وجہ کیا ہے نہیں معلوم۔ شاید آگے بڑھنے کا ارادہ رکھتا ہے اور سوچ رہا ہے کہ یہاں مورچے قائم کرنے سے کیا فائدہ؟ یا پھر یہ سوچ رہا ہے کہ اس پر کوئی حملہ نہیں کرے گا اس لئے کسی مورچہ کی ضرورت نہیں ہے۔ بہر حال یہ سب اس کے لئے خیالی پلاؤ ہی ثابت ہو گا‘۔

لفٹننٹ بول رہے تھے اور ہم دونوں سنتے جا رہے تھے کہ اتنے میں دریاے کرخہ کے نزدیک پہنچ گئے۔ میں نے کہا' یہاں سامنے عراقیوں نے بہت سے ٹینک کھڑے کر رکھے ہیں لیکن صحرا ناہموار ہے اس لئے مشکل سے ہی دکھائی دیتے ہیں'۔

'آپ کو پتہ ہے یہ ٹینک تقریباً کہاں ہیں'؟

'جی بالکل' میں نے کہا اور درست سمت کی طرف اشارہ کیا۔اس کے بعد غفار بولے 'ہم لوگ مستقل ان کی تلاش میں جاتے ہیں تا کہ کوئی ایک ٹینک ڈھا سکیں اور اس کے لئے کئی لوگوں کی جان خطرے میں پڑ جاتی ہے اور اب تو ہم یہ بھول ہی گئے تھے کہ دشمن کو دور سے بھی مارا جا سکتا ہے'۔

لفٹننٹ ہنسے 'آج ٹرائی کر لیتے ہیں'۔

اب ہم ایک گاؤں کے نزدیک تھے۔ میں نے کہا' شمال کی طرف مڑ لیجئے'۔ ہم ایک ناہموار راستہ پر آ گئے، گاڑی مشکل سے آگے بڑھ پا رہی تھی۔ ہم اتر آئے۔ لفٹننٹ نے کانسٹبل سے کہا' وائرلیس لاؤ'۔

اس نے پی، آر، سی ۷۷ انٹینا جوڑ کر وائر لیس کندھے پر اٹھایا اور ہمارے ساتھ چل پڑا۔ گاؤں کا ایک شخص دور سے ہمیں دیکھ رہا تھا اس کے بعد اچانک بھاگ گیا۔ لفٹننٹ نے پوچھا 'یہ بھاگا کیوں ہے'؟

میں نے کہا 'اتنی دور سے اس کے لئے یہ پہچان کرنا مشکل ہے کہ ہم عراقی ہیں یا ایرانی'۔

'میں نے سنا ہے عراقی بہت سے دیہاتوں میں در آئے ہیں اور اب آسانی سے گھومتے پھرتے ہیں'۔

'ہاں افسوس کہ ایسا ہی ہے۔ کچھ دن پہلے اسی گاؤں میں آکر کئی لوگوں کو مار کر چلے گئے'۔

لفٹننٹ چونک اٹھے، غمزدہ آنکھوں سے ہماری طرف دیکھنے لگے۔

'صحیح کہہ رہے ہیں؟ کیسے'؟

'ایک دن اچانک گاؤں پر ٹوٹ پڑے اور تیس لوگوں کو گرفتار کر کے ساتھ لے گئے اس کے بعد کسی کو کوئی پتہ نہیں چل رہا تھا کہ ان کے ساتھ کیا ہوا اور پھر ایک دن لوگوں کو اچانک ایک قبر ملی۔ انھوں نے پہلے سوچا کہ یہ جنگلی خنزیروں کا کام ہے انہوں نے پیروں سے یہ جگہ کھودی ہے لیکن جب قبر سے باہر پڑے ایک انسانی ہاتھ پر نظر پڑی تو۔۔۔'۔

میں جب یہ بتا رہا تھا تو لفٹننٹ کے چہرہ پر غصہ اور تعجب کے ملے جلے آثار نظر آرہے تھے۔ اس کے بعد زیر لب بولے 'کمینے۔۔۔ کمینے۔۔۔'۔

اب ہم ایک ٹیلے پر کھڑے تھے۔ عراقی بالکل ہمارے بالمقابل تھے۔ میں نے لفٹننٹ کو بتایا کہ وہ لوگ تقریباً کہاں پر ہیں۔ کانسٹبل سے وائرلیس لیا۔ آرٹلری سے بات کی اور اس کے بعد قطب نما نکال کر ہماری بتائی جگہ کی سمت کا اندازہ لگایا اور آرٹلری والوں سے کہا کہ ایک دود آور گولہ پھینکیں۔

آرٹلری کے فائر اور توپ کے ملازم کی آواز 'راستہ میں' وائرلیس پر سنائی دی اور کچھ ہی دیر بعد گولہ غراتا ہوا ہماری طرف آپہنچا۔ تعجب ہوا اس سے پہلے

میں نے عراقیوں کے گولوں کی آوازیں سنی تھیں؛ کسی میں اتنا غراہٹ نہیں تھی! جب گولہ ہمارے پاس آکر گرااور وہاں سے مٹی، پتھر اور ڈھیلے ہوا میں اڑے تو پتہ چلا کہ آواز میں فرق کیوں ہے۔

قبل اس کے چھرے ہمیں لگیں ہم لوگ زمین پر لیٹ گئے اور ایک لمحہ کے لئے فاسفرس گولہ کے دھویں میں جس کی بو بھی بہت تیز تھی کھو گئے۔

میں نے تعجب سے لفٹننٹ کو دیکھا اور اس کے بعد مذاق میں کہا 'بہت اچھا ہے۔ کہئے اور دو تین مزید فائر کر دیں'۔

لیکن انہیں کچھ غصہ آگیا تھاوائر لیس پر کہنے لگے 'کیا کر رہے ہو؟ دھیان کہاں ہے؟ سیدھے ہم لوگوں کے سر پر مارا ہے'۔ اس کے بعد انہیں ڈائریکشن صحیح کرنے کو کہااور درست اس جگہ کی نشاندہی کی جو ہم نے انہیں بتائی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ اب گولے عراقیوں ہی کے ٹھکانوں پر لگ رہے ہیں لیکن چونکہ کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھااس لئے لفٹننٹ کچھ پریشان تھے۔

'کچھ دکھائی نہیں دے رہا ہے۔ایسے کیسے پتہ چلے گا۔کچھ اور کرنے کا بھی وقت نہیں ہے'۔

'اسی پیچھے کے گاؤں میں چل کر چھتوں سے دیکھتے ہیں'۔

'نہیں! آپ ہی لوگ تو کہہ رہے تھے کہ وہاں عراقیوں کا آنا جانا ہے۔ابھی بھی ان کا کوئی وہاں ہو سکتا ہے'۔

'اب کوئی نہیں ہے، ہمیں خبریں ملتی رہتی ہیں'۔

'لیکن پھر بھی مجھے نہیں لگتا کہ لوگ ہمارے ساتھ تعاون کریں گے'۔

'تعاون کریں گے، میں ذمہ داری لیتا ہوں'۔

میں اور غفار نے اتنا اصرار کیا کہ آخر کار لفٹننٹ مان گئے۔اب ہم گاؤں پہنچ رہے تھے۔گلیاں سنسان تھیں، لگتا تھا وہاں کوئی رہتا ہی نہیں ہے۔ غم نصیب لوگ ہمیں دیکھ کر چھپ گئے تھے۔میں نے ایک گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ایک آدمی باہر نکلا اس سے میں نے عربی میں کہا 'سلام! ہم لوگ ایرانی ہی

ہیں۔رصد کے لئے آپ کے گھر کی چھت استعمال کرنا چاہتے ہیں'۔کچھ سوچنے کے بعد مان گیا۔ہم صحن میں داخل ہوئے اور سیڑھی لگا کر چھت پر چڑھ گئے۔وہاں سے علاقہ اچھی طرح دیکھا جا سکتا تھا۔لفٹننٹ نے پھر سے گولہ باری کے لئے کہا۔

دوسرے یا تیسرے گولہ نے ایک ٹرک کو آگ لگا دی۔لفٹننٹ نے خوش ہو کر دوربین مجھے تھمائی اور کہا'آپ بھی دیکھئے،ہم نے نشانہ لے لیا ہے'۔

دوربین لے کر میں نے دیکھا ٹرک جل رہا تھا،منہ سے نکلا'جیتے رہئے لفٹننٹ صاحب' اور دوربین غفار کو پکڑائی۔وہ دیکھ کر بولے'اگر حسین کو پتہ چلے تو بہت خوش ہوں گے'۔

کچھ ہی دیر بعد لوگوں کا ڈر ختم ہو گیا اور آہستہ آہستہ وہ بھی اپنی اپنی چھتوں پر چڑھنے لگے۔جب کوئی ٹینک یا گاڑی اڑتی تو لوگوں کی خوشی دوبالا ہو جاتی۔اب ہمیں شاباشی دے رہے تھے۔

ہمارے سامنے بہت ہی گاڑھا دھواں اڑ رہا تھا یہ منظر دیکھ کر ان لوگوں کو بہت سکون ملا جن کے اعزاء واقارب عراقیوں نے تہ تیغ کر دیے تھے۔

ایک گھنٹہ تقریباً ہم چھت پر رہے ہوں گے۔ جب ہمارا کام ختم ہوا تو ہم واپسی کے لئے نیچے اترے۔ آگے بڑھنا چاہا تو دیکھا کہ سیاہ پوش خواتین سینیوں میں چائے اور روٹیاں لے کر ہمارا انتظار کر رہی ہیں۔ یہ منظر دیکھ کر ہم سب کی آنکھیں چھلک گئیں اور ناشتہ کرنے بیٹھ گئے۔ اس کے بعد ہم نے لفٹننٹ کے کیمرہ سے لوگوں کی کی تصویریں بھی کھینچیں۔ جب ہیڈ کوارٹر واپس آ رہے تھے تو غفار بولے 'آج کا دن تو بڑا مفید رہا'۔

دشمن کو بھاری نقصان پہنچانے پر ہم سب خوش تھے۔ کالج کے سامنے ہم نے لفٹننٹ اور ان کے ساتھی کانسٹبل کو خدا حافظ کہا اور حسین کی خدمت میں جا حاضر ہوئے۔

'کیا ہوا'؟ حسین نے پوچھا تو ہم نے مکمل رپورٹ پیش کر دی۔ بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے 'یہ کام جاری رہنا چاہیئے۔ ہمارے ساتھی اس علاقہ سے

خوب واقف ہیں۔ اس کام میں انہوں نے بہت محنت کی ہے لہٰذا اپنے تجربات سے دوسروں کو بھی مستفید کرنا چاہیئے'۔

وہاں محمد حسن قدوسی بھی تھے بولے 'میں بھی ان کی مدد کے لئے تیار ہوں'۔

حسین کہنے لگے 'فی الحال بہتر یہ ہے کہ ہم اپنا کام پھیلائیں۔ علاقہ میں عراقی کئی جگہ آچکے ہیں۔ خود کو ایسا تیار کریں کہ ضرورت پڑنے پر ہر جگہ سے ان پر حملہ کیا جاسکے۔ کل جفیر چلیں گے'۔

'دن میں'؟

'ہاں'۔

'دن میں بارودی سرنگ کیسے نصب کی جائے گی'؟

'صرف علاقہ کی جانکاری کے لئے چلیں گے'۔

اگلے دن میں، حسین، قدوسی اور حسن دو موٹر سائکلوں پر سوار ہو کر جفیر کی طرف روانہ ہو گئے۔ جہاں تک ممکن تھا وہاں تک موٹر سائکلوں سے گئے اور

پھر انہیں ایک جگہ چھپا دیا اور ان پر گھاس ڈال دی تاکہ دکھائی نہ دیں۔ موسم کا مزاج بھی بدل رہا تھا، ہور کی طرف سے کہرا پھیلتا جا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد ہم تیل کے کنوؤں کے پاس تھے۔ ساتھی قدرے تھک چکے تھے، کچھ رات میں بھی مشن پر تھے۔ حسین نے کہا 'یہاں کچھ دیر آرام کریں گے'۔

زمین پر بیٹھ گئے۔ قدوسی رات بھر دوڑتے بھاگتے رہے تھے سو گئے۔ حسین نے علاقہ کا نقشہ نکال کر سامنے رکھا اور اس پر کچھ نشان لگائے۔ بولے 'اچھا ہوا آ گئے، کچھ نقشے صحیح نہیں ہیں'۔

ایک گھنٹہ آرام کے بعد ہم پہلے 'ام الغفاری' گئے پھر 'طاہریہ'۔ طاہریہ جب پہنچے تو حسین رک گئے اور دیر تک آس پاس دیکھتے رہے، کچھ سوچ رہے تھے، حالت بھی عجیب لگ رہی تھی۔ کسی میں یہ پوچھنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ کیوں رک گئے ہیں اور کیا سوچ رہے ہیں۔

کچھ دیر کے بعد انہوں نے حسن کی طرف رخ کر کے پوچھا 'یہ طاہریہ ہے'؟

حسن نے جواب دیا 'جی طاہریہ ہے'۔

حسین کے ہونٹوں پر تبسم کی ہلکی سی لکیر دکھائی دی جس کے معنی میں اس دن نہیں سمجھ سکا تھا۔ کیا انہیں پتہ چل گیا تھا کہ یہی وہ جگہ ہے جہاں وہ اور ان کے وفادار ساتھی قتل ہو جائیں گے؟ کیا وہ جانتے تھے کہ عنقریب وہاں سخت جنگ ہو گی؟ جھک کر تھوڑی سے مٹی اُٹھائی اور اسے غور سے دیکھتے رہے اس کے بعد انگلیاں کھول دیں اور زیر لب دہرایا 'طاہر یہ'۔

پھر حسن سے پوچھا 'آپ کے خیال میں یہاں سے ہویزہ کتنی دور ہے'؟

'تقریباً بیس کلو میٹر'۔

'میں بھی یہی سوچ رہا تھا'۔

عجیب نگاہیں تھیں، اپنے آپ میں ہی گم تھے جیسے بھول گئے ہوں کہ ان کے ساتھ بھی کوئی ہے۔ اس کے بعد قدوسی کے شانہ پر ہاتھ رکھا اور اسے محبت بھرے انداز سے دبا کر کہا 'میرا خیال میں ہمیں جلد اپنی محنت پھل ملے گا'۔

میں نے پوچھا 'کوئی خبر ملی ہے؟ کوئی آپریشن ہونے والا ہے'؟

مسکرائے اور کچھ نہ بولے۔ ہم نے پھر سے چلنا شروع کیا اور تھوڑی ہی دیر میں دشمن کے پاس پہنچ گئے۔ حسین نے کہا 'لیٹ جایئے زمین پر'۔

ہم لیٹ گئے اور سینہ کے بل تھوڑا آگے بڑھے۔ کچھ عراقی ٹہل ٹہل کر زمین پر کچھ دیکھ رہے تھے جیسے کچھ کھو گیا ہو اور ڈھونڈھ رہے ہوں۔ حسین بولے 'کم بخت کیسے آرام سے یہاں ٹہل رہے ہیں'۔

میں نے پلٹ کر دیکھا تو کافی غصہ میں تھے اور آر، پی، جی ہاتھ سے دبائے ہوئے تھے۔ میرا ہاتھ بے ساختہ ٹرائیگر پر چلا گیا۔

'ماردوں کیا'؟

حسین نے قدوسی اور حسن کو دیکھ کر کہا 'ہم عراقیوں کے قلعہ میں ہیں لوٹ نہیں پائیں گے'۔

حسن جو جھاڑیوں کی اوٹ سے دشمن کو گھور رہے تھے بولے 'افسوس ہوتا ہے انہیں ایسے ہی چھوڑنے پر، شاید انہیں نے گاؤں والوں کا قتل عام کیا تھا'۔

حسین کہنے لگے، 'نہیں۔ اس وقت واپس چلنا ہی بہتر ہے۔ رات میں ان کی خبر لیں گے، خالی ہاتھ نہیں آئیں گے۔ آپ لوگ گاڑیوں کا مورچہ ذہن میں رکھ لیجئے گا'۔

ان ٹہلنے والے عراقی فوجیوں کی پشت پر ان کا مورچہ نظر آرہا تھا جس کی شکل تقریباً آدھے دائرہ کی مانند تھی۔

طے پایا کہ اگلی رات ان کی خبر لی جائے گی اور آہستہ آہستہ اس جگہ سے دور ہو گئے اور آکر موٹر سائیکلیں ڈھونڈھیں۔

ہویزہ سے کچھ پہلے فوج کی ایک ٹکڑی نظر آئی جو سوسنگرد کی طرف جا رہی تھی۔ ہم رک کر انہیں دیکھنے لگے۔

'یہ لوگ کون ہیں'؟

'قزوین بریگیڈ ہے یا ہمدان بریگیڈ'۔

'کیا یہ لوگ بھی علاقہ میں آ چکے ہیں؟ مجھے تو صرف دزفول بریگیڈ کی اس طرف منتقلی کی خبر تھی'۔

'ہاں سب علاقہ میں اکٹھا ہو رہے ہیں۔ اگر آپریشن ہوا تو ہویزہ سے ہی ہو گا اور پھر دب حردان اور حمیدیہ پر قبضہ کرتے ہوئے ہم خرم شہر تک جا سکتے ہیں۔ کیا معلوم اس آپریشن کا اختتام خرم شہر کی آزادی پر ہو'۔

ہم کھڑے رہے یہاں تک کہ وہ ٹکڑی ہمارے پاس سے گذر کر بہت دور چلی گئی۔

اگلی رات ہم اپنے شناخت کردہ علاقہ میں بارودی سرنگیں نصب کرنے گئے اور کامیابی سے واپس ہوئے۔ گاڑی سے گئے تھے، راستہ میں بھی گڈھے گڑھے تھے اور لائٹیں بھی بجھا کر چلنا پڑ رہا تھا۔ حسین کے پاس آر، پی، جی تھی اور باقی سب کے پاس جی۔۳ اور کلاشنکوف۔ جوان بہت تھکے تھے گاڑی میں سو گئے۔

گاڑی جب ایک چھوٹی سے کھائی میں گری تو ہم اپنا توازن برقرار نہ رکھ پائے اور کئی اچھل کر حسین پر جا گرے۔ اتنے تھکے تھے کہ بغیر ادھر ادھر توجہ کئے دوبارہ اونگھنے لگے۔ تبھی میں نے دیکھا کہ حسین اپنا ہاتھ دیکھ رہے ہیں۔ کچھ دیر بعد پوچھا' آپ میں سے کون زخمی ہوا ہے'؟ سب کی نیند اڑ گئی دیکھا حسین کا ہاتھ خون آلود ہے۔ پتہ چلا کہ زخمی کوئی اور نہیں بلکہ حسین ہی ہوئے ہیں۔ آر، پی، جی کی پائپ ان کے سر پر لگی تھی اور زخمی ہو گئے تھے۔ صبح تین بجے ہویزہ پہنچے۔ ابھی رات کے کھانے کے لئے دی گئی کھجوریں اور روٹی کھانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ حسین نے سر باندھا اور ہم لوگ کھانا کھانے بیٹھے۔ ہیڈ کوارٹر پر موجود کچھ سپاہی جاگ رہے تھے۔ حسین نے ان سے پوچھا 'خیریت ہے؟ کچھ ہوا تو نہیں'؟

'ہوا ہے'۔

'کیا ہوا ہے'؟

'حاج غالب گاؤں سے ایک صاحب آئے تھے'۔

'ہاں تو'؟

'بتارہے تھے کہ عراقی دریائے کرخہ پر پل تعمیر کر رہے ہیں'۔

'کس جگہ'؟

'حاج غالب گاؤں کے سامنے'۔

یہ خبر سنی تو ہماری نیندیں اڑ گئیں، حسین کے چہرہ پر غم کے بادل چھا گئے۔کہنے لگے 'یہ پل ان کے کام نہیں آنا چاہئے۔اس لئے کہ اس کے ذریعہ انہیں بہت زیادہ رسد پہنچنے کا امکان ہے۔کل جا کر دیکھتے ہیں کہ پل بنا چکے ہیں یا بنارہے ہیں'۔

قدوسی کی آواز آئی 'اس طرح کے پل بنانا کوئی مشکل تھوڑی ہوتا ہے۔بڑی بڑی پائپیں پانی میں ڈال کر اوپر مٹی ڈال دی جاتی ہے'۔

حسن بولے 'پل کا پتہ میں لگاتا ہوں' اور اٹھ کھڑے ہوئے۔

'حسن ابھی جارہے ہیں کیا'؟

'نہیں، دن دھاڑے تھوڑی یہ کام ہو سکتا ہے۔ ابھی میں گھر جا رہا ہوں تھوڑا آرام کروں گا'۔

حسن ہم سے الگ ہو کر چلے گئے۔ صبح دوبارہ ہلکی ہلکی بارش ہونے لگی۔ نماز اور ورزش کے بعد حسین کہنے لگے' مجھے ایک کام کے سلسلہ میں اہواز جانا ہے'۔

میں نے کہا' میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گا'۔

کہنے لگے 'نہیں میں اکیلا جاؤں گا، آپ لوگ پل کا پتہ لگائیے، زیادہ دیر نہیں لگنی چاہئے'۔

میں نے کہا' آپ کل پوری رات جاگے ہیں، کچھ اپنے اوپر رحم کھائیے نہیں تو بیمار پڑ جائیں گے'۔

'آرام نہیں کر سکتا۔ مجھے جانا ہو گا، کماندران کے ساتھ میٹنگ ہے'۔

'انہیں کپڑوں میں اعلیٰ فوجی حکام کی میٹنگ میں جائیں گے'؟

اپنے کپڑوں پر ایک نظر ڈال کر کہنے لگے' ان کپڑوں میں کیا پریشانی ہے'؟

میں نے کہا 'آپ خود کمانڈر ہیں سادے کپڑوں میں کیسے وہاں جایئے گا۔ کم سے کم رضاکار ملیشیا کی وردی پہن لیجئے'۔

کہنے لگے 'یہ وردی میرے لئے نہیں ہے'۔

وہ کسی صورت ماننے کے لئے تیار نہیں تھے لیکن میں نے دیگر ساتھیوں کو بھی بلا لیا اور ان سے اتنا کہا کہ آخر کار وردی پہننے پر مجبور ہو گئے۔ پینٹ بھی بڑی تھی اور شرٹ بھی۔ حسین نے وردی پر ایک نظر ڈالی اور کہنے لگے 'دیکھا میں کہہ رہا تھا نا کہ یہ کپڑے مجھے نہیں آتے، میرے سائز کے سیے ہی نہیں گئے ہیں لہٰذا انہیں اسی کو دینا بہتر ہے جو ان کا اہل ہے'۔

'آپ سے زیادہ اہل کوئی نہیں ہے'۔

درزی کے یہاں سے وردی چھوٹی کروائی اور آخر انہیں مجبوراً زیب تن کرنا پڑی۔ بیلٹ بھی باندھی اور جب گاڑی پر بیٹھنے لگے تو اچانک واپس آ گئے، جیسے کچھ بھول گئے ہوں۔

'آر، پی، جی؟ آر، پی، جی بھول گیا تھا'۔

یہ سن کر وہاں جتنے تھے سب ہنسنے لگے۔

'اہواز بھی ساتھ لے جائیں گے'؟

حسین بھی ہنسنے لگے اور چلے گئے۔ یہ ان کا اہواز کا آخری سفر تھا۔

دوپہر سے پہلے پہلے حسن واپس آ گئے۔ میں نے پوچھا 'کیا ہوا'؟

'پل بن گیا ہے'۔

'یعنی استعمال بھی کر رہے ہیں'؟

'ہاں قابل استعمال ہے'۔

محمد حسن قدوسی بھی وہیں تھے، بہت پریشان ہو گئے۔ کہنے لگے 'ہمیں ایک منٹ بھی ضائع نہیں کرنا چاہیئے۔ آج ہی کی رات پل منہدم ہونا چاہیئے۔ اس کے نزدیک جا سکتے ہیں'؟

'مشکل سے'؟

'مشکل سے مطلب'؟

'پل پر سنتری ہے اور دوسری طرف بھی ممکن ہے کمین کئے ہوں'۔

'صحیح پتہ نہیں چل پایا کہ کمین کئے ہیں یا نہیں'؟

'نہیں، دن میں تو نہیں لگتا لیکن رات کا پتہ نہیں'۔

ہم کچھ دیر سوچنے لگے۔ اس پل سے علاقہ کی صورتحال یکسر بدل سکتی تھی۔

قدوسی نے کہا 'ہمیں ہر قیمت پر پل گرانا ہے چاہے تصادم ہو جائے اب حسن یہ بتایئے کہ خود پل کیسا ہے'؟

'بڑی بڑی پائپوں کا بنا ہے۔ اندازاً چھپن انچ کی پائپیں ہوں گی۔ اس طرح کی چند ایک پائپیں ایک ساتھ ملا کر لگا رکھی ہیں اور دریا کے دونوں طرف انہیں مضبوطی سے باندھ رکھا ہے اور پھر ان کے اوپر دو میٹر سے زیادہ مٹی ڈال رکھی ہے'۔

قدوسی بولے 'اس کا مطلب ایک بارودی سرنگ سے کچھ نہیں ہونے والا'۔

حسن کہنے لگے ’نہیں، دونوں طرف کم سے کم دو دو بارودی سرنگیں نصب کرنا پڑیں گی‘۔

قدوسی نے کہا ’اگر اس طرح پل منہدم ہو جاتا ہے تو حسن صاحب کیا آپ علاقہ کا نقشہ بنا سکتے ہیں تا کہ پتہ چلے کہ ہمیں کیا کر سکتے ہیں‘؟

ہم کاغذ قلم لائے اور حسن نے نقشہ بنانا شروع کیا اور ساتھ میں بتاتے گئے کہ ’یہاں ہمارا گاؤں ہے۔ ہمارے گاؤں سے پل تقریباً چار کلو میٹر کی دوری پر اور حاج غالب کے سامنے ہے۔ دشمن کے کچھ ٹھکانے ہمارے گاؤں کے سامنے ہیں اور کچھ حاج غالب کے سامنے اور ان اصل ٹھکانہ تھوڑا آگے ہے‘۔

میں نے کہا ’اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمیں ان کے سامنے ہی سے گذرنا بھی ہے اور ان کے سامنے ہی پل بھی توڑنا ہے۔ جو بہت سخت کام ہے، کر پائیں گے محمود[3]‘؟

’کر پانا چاہیے لیکن سخت ہے‘۔

---

[3]۔ محمود شہید محمد حسن قدوسی ہی کا دوسرا نام ہے۔

‘تو حسین کو آجانے دیجئے’۔

‘ہم کام شروع کرتے ہیں حسین بھی یقیناًرات تک آجائیں گے’۔

‘بظاہر کوئی اہم میٹنگ تھی، شاید نہ آئیں’۔

‘آپ ابھی حسین سے آشنا ہوئے ہیں میں انہیں برسوں سے جانتا ہوں۔ ہم مشہد میں ایک ساتھ مصروف رہے ہیں۔ وہ مظاہرے اور میٹنگیں مجھے آج بھی یاد ہیں۔ ہم لوگ ایک ساتھ خامنہ ای صاحب کے درس میں جاتے تھے، ایک ساتھ ہاشمی نژاد صاحب کے گھر جاتے تھے، ایک ساتھ مظاہرے منظم کرتے تھے۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کوئی اہم کام ہو اور حسین نہ آئیں۔ اگر کہیں گئے ہوتے تھے تب بھی پہنچ جاتے تھے۔ مجھے پتہ ہے ابھی بھی ان کا دل یہاں ہے اور شاید انہوں نے آپریشن کا منصوبہ بھی تیار کر لیا ہو’۔

طے پایا کہ چل کے دیکھتے ہیں کہ حسن رکابی کتنی بارودی سرنگیں ہمارے لئے لے کر آئے ہیں۔ جب ہم ایک دوسرے سے الگ ہو رہے تھے تو حسن نے کہا

‘ایک مسئلہ اور بھی ہے’۔

'کیا'؟

'کتے! کتوں سے ہوشیار رہنا ہو گا۔ ہمارے گاؤں میں بھی ہر جگہ کتے ہیں اور حاج غالب میں بھی۔ جیسے ہی کوئی متحرک شے دیکھیں گے بھونکنے لگیں گے اور سب کو خبر کر دیں گے'۔

قدوسی نے ہنس کر کہا 'گھبرائیے مت! کتوں کو پتہ نہیں لگنے دیں گے'۔

حسن کہنے لگے 'تو میں گھر جا رہا ہوں۔ ایک تو یہ کہ سب کو پتہ رہے کہ میں گاؤں میں ہی ہوں دوسرے یہ کہ وہاں سے میں اچھی طرح سے حالات پر نظر رکھ سکتا ہوں۔ میں وہیں آپ لوگوں کا انتظار کروں گا آدھی رات کے بعد آپ لوگ وہیں میرے پاس آیئے'۔

میں نے کہا 'میں آپ کو لینے آؤں گا'۔

کہنے لگے 'تو صحن کی دیوار سے کود یے گا اور سیدھے میرے کمرہ کا دروزہ کھٹکھٹایئے گا۔ میں نہیں چاہتا کہ بچے جاگ جائیں'۔

میں نے کہا،'بسر و چشم'۔

ہم نے ابتدائی ضروری امور انجام دیے، سہ پہر ہو گئی لیکن ابھی تک حسین کا کچھ پتہ نہیں تھا۔اب ان کے آنے کی کوئی امید نہیں تھی۔ اتنے میں ایک گاڑی کالج میں داخل ہوئی، حسین ہی تھے۔ہم خوش ہو کر ان کے استقبال کے لئے آگے بڑھے۔

'دیر کر دی حسین آپ نے'۔

'کام زیادہ تھا۔ تھوڑی دیر کے لئے گھر بھی رخصت ہونے گیا، شاید یہ رخصت آخر ہو'۔

گاڑی سے اترے، بدلے بدلے لگ رہے تھے، چہرہ کا رنگ فق تھا۔اپنے کمرہ کی طرف بڑھ گئے۔

'کیا ہوا حسین؟ آپ ٹھیک تو ہیں'؟

'کچھ نہیں بس سر میں تھوڑا درد ہو رہا ہے'۔

'تھوڑا! آپ تو چل بھی نہیں پا رہے ہیں'؟

'ٹھیک ہو جاؤں گا۔ پل کا کیا ہوا'؟

'حسن پتہ لگا کر آئے تھے۔ سب کچھ تیار ہے، آج رات اڑا دیں گے'۔

مسکرائے اور وضو خانہ کی طرف چلے گئے۔ اندھیرا ہوا جا رہا تھا۔ ہم نے وضو کر کے حسین کی اقتداء میں مغرب و عشا کی نماز ادا کی۔

حسین بیٹھ بھی نہیں پا رہے تھے۔ اپنے کمرہ میں جا کر لیٹ گئے۔ ہم لوگ ان کے سرہانے گئے۔ میں نے پیشانی پر ہاتھ رکھا تو دیکھا سخت بخار ہے اس کے با وجود انہیں آپریشن کی فکر تھی۔

'پل کی طرف کب جانا ہے'؟

'آپ اس حالت میں ہمارے ساتھ نہیں آسکتے'۔

'آپ لوگ کر لیں گے'؟

'جی! آپ مطمئن رہئے'۔

'ٹھیک ہے تو آپ آپریشن کمانڈر کے فرائض انجام دیجیئے۔ حسن کہاں ہیں'؟

'گھر گئے ہیں، طے پایا ہے کہ ہم راستہ سے ان کو ساتھ لے لیں گے'۔

'جتنے مجاہد ضرورت ہیں ساتھ لے جایئے اور جلدی کیجئے'۔

قدوسی سمیت چار افراد ساتھ لئے، چار بارودی سرنگیں اٹھائیں اور میگزین بھی بھر لئے۔ ہر آدمی نے کچھ گرینیڈ بھی ساتھ رکھ لئے۔ نیسان وانٹ پر سوار ہوئے اور چل دیے۔ قسمت اچھی تھی، اندھیرا تھا۔ میں تھوڑا گھبرا رہا تھا۔ یہ پہلا اہم مشن تھا جس کی ذمہ داری میرے کندھوں پر تھی لیکن جب میں نے قدوسی کا مطمئن چہرہ دیکھا تو مجھے بھی اطمئنان ہو گیا۔ قدوسی ایسے مطمئن تھے کہ لگ ہی نہیں رہا تھا وہ کسی ایسے آپریشن کے لئے جا رہے ہیں جس کے انجام کا پتہ نہیں۔

سب خاموش تھے۔ فقط گاڑی کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ ڈرائیور نے صرف چھوٹی لائٹیں جلائی تھیں اور مجبوراً آہستہ چل رہا تھا۔ حسن کے گاؤں سے دو

کلو میٹر کے فاصلہ پر میں نے کہا کہ 'گاڑی یہیں روک دی جائے۔اس سے زیادہ گاڑی سے چلنا ٹھیک نہیں ہے'۔

گاڑی رک گئی۔ میں نے باڈی لائٹ آن کی اور ایک بار پھر علاقہ کے نقشہ کا مطالعہ کیا۔

'یاد رکھئے کہ اس آپریشن میں تصادم کا ازحد امکان ہے لہٰذا بہت ہوشیاری سے کام لینا ہے اور سب سے زیادہ برق رفتاری کی ضرورت ہے۔جیسا کہ حسن نے بتایا ہے کہ سنتری مستقل پل پر ٹہلتا ہے۔ہمارے پاس وقت بہت کم ہو گا۔جب ہم پل پر پہنچیں گے تو ہر ایک کے پاس بارودی سرنگ نصب کرنے کے لئے صرف پانچ منٹ وقت ہو گا، صرف پانچ منٹ! یاد رکھئے گا'۔

گاڑی سے اترے۔ڈرائیور سے میں نے کہا گاڑی راستہ سے ہٹا دے اور اس پر گھاس پھوس بھی ڈال دیتے ہیں'۔

اس نے گاڑی سڑک کے کنارے چھوٹی سی کھائی میں پہنچا دی اور ہم نے آس پاس کی بڑی گھاس اکھاڑنا شروع کری دی۔ زمین میں نمی تھی لہٰذا اکھاڑنے

میں کوئی دقت نہیں ہو رہی تھی۔ گاڑی ہم نے مکمل طور پر چھپا دی اور بغیر کچھ بولے حسن کے گاؤں کی طرف چل دیے۔ گاؤں کے پاس پہنچ کر میں نے اپنا سامان اتار کر زمین پر رکھا اور کہا کہ 'آپ لوگ یہیں انتظار کیجئے اور اپنی جگہ سے ہلئے بھی مت اور نہ ہی کھڑے ہوئیے تا کہ کتوں کو ہماری خبر نہ ہو'۔

گاؤں کے گھروں کی سیاہی ہمارے سامنے تھی۔ وہاں سے سو میٹر کی دوری رہی ہو گی۔ میں آہستہ آہستہ گاؤں کی طرف بڑھا اس احتیاط کے ساتھ کہ کسی طرح کی کوئی آواز نہ آئے۔ عراقی گاؤں کے بالکل سامنے تھے۔ وہاں سے ان کے ٹھکانے شروع ہوتے تھے اور حاج غالب نامی گاؤں تک پہنچتے تھے۔

حسن کے گھر پہنچ کر میں نے اپنی کلاشنکوف پیچھے لٹکائی، ایک بار پھر میں نے آس پاس دیکھا اور صحن کی دیوار سے اوپر چڑھ گیا۔ مگر چڑھتے ہوئے ایک اینٹ کھسک کر نیچے گر گئی تو میں تھوڑی دیر یہ دیکھنے کے لئے رکا کہ کسی کو پتہ چلا ہے کہ نہیں۔ لیکن کوئی متوجہ نہیں ہوا تھا۔ دیوار کی دوسری طرف کودا اور پنجوں کے بل چل کر حسن کے کمرہ کے پاس پہنچا۔ کمرہ میں اندھیرا تھا میں

نے انگلی سے آہستہ سے دروازہ کھٹکھٹایا اور انتظار کرنے لگا۔ دروازہ کھلتے ہی کلاشنکوف کی نال باہر آئی۔ میں نے کہا 'میں ہوں، حسن '!۔ یہ سن کر انہوں نے دروازہ پورا کھولا اور مجھے گلے لگایا۔

'باقی لوگ کہاں ہیں '؟

'باہر ہیں۔ حسین کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی وہ نہیں آسکے '۔

حسن تھوڑی دیر چپ ہوگئے، چہرہ پر پریشانی کے آثار نظر آئے۔ 'کہو اندر آ جائیں اور آخری بار پھر ساری چیزوں کا جائزہ لے لیں '۔

گھر کا دروازہ کھولا اور احتیاط سے باقی ساتھیوں کے طرف چل دیے۔ جب کمرہ میں ہم واپس پہنچے تو حسین نے چراغ جلایا اور میں نے نقشہ سامنے پھیلا دیا اور پھر پانچ منٹ کے لئے ہم نے ساری چیزیں دوبارہ ساتھیوں کو سمجھائیں۔

'اُدھر سے پل کی طرف چلتے ہیں۔ اُدھر سے بہتر ہے، وہاں سے دشمن کو زیادہ ہماری کاروائی کی امید نہیں ہوگی۔ دوسری چیز پل کا چکر لگانا ہے یہ کام دور سے

کرنا ہوگا یعنی پل پہنچنے سے پہلے ہمیں گھوم کر یعنی ایک قوس بنا کر اُس طرف جانا ہوگا۔

حسن بولے 'اس طرح ان کے اصل ٹھکانہ سے ہم بہت قریب پہنچ جائیں گے'۔

میں نے کہا 'اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے'۔

اتنے میں میری نظر قدوسی کے ہشاش بشاش چہرہ پر پڑی جیسے شادی میں جا رہا ہو۔

حسن کے گاؤں سے نکل کر ہم گھاس کے اندر اندر سے چلتے گئے اور حاج غالب کے نزدیک جا پہنچے۔ وہاں ایک چھوٹی سی نہر تھی جو دریائے کرخہ ہی سے آ رہی تھی۔ ہم اس نہر کے کنارے کنارے چلتے گئے لیکن نظریں پل پر ہی تھیں۔ چلتے چلتے ہم اس کے آخر تک پہنچے اور وہاں سے مڑ کر تھوڑا فاصلہ پر آ کر رک گئے۔ حسن نے کہا 'آپ لوگ یہیں رکئے میں تھوڑا منہ ہاتھ دھو کر

آتا ہوں۔ کتوں کا خیال رکھئے گا اگر انہیں چھوٹی سی آواز بھی آگئی تو بھونکنا شروع کردیں گے اور عراقی یہاں ٹوٹ پڑیں گے'۔

ہم زمین پر لیٹ گئے اور حسن آگے چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد آکر کہنے لگے سنتری کوئی نہیں لیکن تھوڑی تھوڑی دیر بعد پل کا چکر ضرور لگاتے ہیں۔ ہمیں ان کے آنے سے پہلے پہلے اپنا کام کرلینا ہے'۔

میں نے کہا، بسم اللہ۔ پانچ منٹ بھولئے گا نہیں'۔

جھکے جھکے ہم پل کے نزدیک پہنچے، کتے کہیں نہیں تھے۔ صرف پانی کے پائپوں سے ٹکرانے کی آواز آرہی تھی۔

جب پل کے سرے پر پہنچ گئے تو میں نے حسن سے کہا' آپ جایئے اور اس طرف بارودی سرنگ نصب کرنے کا کام سنبھالئے، ہر چیز کا خیال رکھئے گا'۔

حسن نے سر ہلایا اور اندھیرے میں کھو گئے۔ ایک مجاہد کو میں نے اِس سرے کی ذمہ داری سونپی۔ ایک بار میں نے گاؤں کی طرف دیکھا، خاموشی تھی، کتوں کو کچھ پتہ نہیں چلا تھا۔ کہیں سے بھونکنے کی آواز نہیں آ رہی

تھی۔ قدوسی اور ایک اور ساتھی پل کی دوسری طرف چلے گئے۔ جب تک وہ لوگ پل پر سے گذر نہیں گئے میرا اور میرے ساتھی کا ہاتھ ٹرائیگر پر ہی رہا۔ جب وہ پل پر سے گذر گئے ہم نے کھرپیاں نکالیں اور کھدائی شروع کر دی جب اچھا خاصا گڈھا بن گیا تو بھاری بارودی سرنگیں سامان میں سے نکالیں اور گڈھے میں رکھ کر اوپر سے جلدی جلدی مٹی ڈال دی۔ کام پورا ہو گیا تھا اور معینہ وقت بھی۔ سر اٹھایا تو ایک کتے کے بھونکنے کی آواز آئی، میں چونک گیا، آواز گاؤں کی طرف سے آ رہی تھی۔ پل کے اُس طرف دیکھا تو قدوسی اور ان کے ساتھی کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ دوبارہ گاؤں کی طرف دیکھا تو ایک اور کتے کے بھونکنے کی آواز آئی۔ اب آوازیں نزدیک ہوتی جا رہی تھیں۔ اتنے میں حسن آ گئے۔ آہستہ سے بولے 'کتوں کے بھونکنے کی آواز سن رہے ہو؟ گشت پر مامور عراقی پہنچ رہے ہیں'۔

میں نے کہا 'ہمارا کام ختم ہو گیا ہے'۔

دوسرا سایہ پل کے اس طرف سے آرہا تھا جب نزدیک پہنچا تو میں نے اس سے پوچھا 'قدوسی کہاں ہیں'؟

جواب ملا 'ان کا کام ابھی مکمل نہیں ہوا ہے'۔

'آپ لوگ پل کے اطراف میں پوزیشنیں سنبھال لیجئے'۔ وہ لوگ پوزیشنیں سنبھالنے کے لئے پراکندہ ہو گئے۔ میں جھکا جھکا پل پر چل کر قدوسی کے پاس پہنچا۔

'محمود آ کیوں نہیں رہے ہیں'؟

'میرا کام ختم نہیں ہوا ہے ابھی، یہاں مٹی بہت سخت ہے'۔

میں نے کہا 'رہنے دیجئے! عراقی آرہے ہیں'۔

میں ان کے پاس بیٹھ گیا۔ وہ اطمئنان سے کھدائی کر رہے تھے۔ آس پاس دیکھا کتوں کے بھونکنے کی آوازیں اب پہلے سے تیز ہو گئیں تھیں۔ قدوسی نے

بارودی سرنگ گڑھے میں رکھی اور اس پر مٹی ڈال دی اور اب ہاتھ سے اس پر مار مار کر برابر کر رہے تھے۔ اطمئنان ایسا کہ جیسے میری بات سنی ہی نہ ہو۔

'چلئے محمود! چلئے'!

'ہمارا کوئی نشان باقی نہیں رہنا چاہئے'۔

آخر کار ان کا کام ختم ہوا اور ہم تیزی سے باقی ساتھیوں کے پاس آ پہنچے۔ اب عراقی بھی پہنچنے ہی والے تھے اور ہم تیزی سے حسن کے گاؤں کی طرف چل پڑے۔ راستہ میں ، میں نے حسن سے کہا 'میں آپ کے سلسلہ میں بہت پریشان ہوں ایسا نہ ہو کہ آپ اپنے گھر والوں کی جان بھی خطرہ میں ڈال دیں۔ انہیں کسی پر امن جگہ منتقل کر دینا بہتر نہیں رہے گا'؟

'نہیں، تب میں اس علاقہ میں آسانی سے آ جا نہیں سکوں گا۔ گھر والوں نے بھی اس صورتحال کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا ہے'۔

گاؤں کے باہر سب نے حسن کو گلے لگایا اور ان سے رخصت ہوئے۔ میں نے سوچا وہ گھر جائیں گے لیکن کہنے لگے ' مجھے حسین کی یاد آ رہی ہے، میں بھی آپ لوگوں کے ساتھ ہی چلوں گا'۔

میں نے کہا' جایئے آرام کیجئے، کل حسین سے مل لیجئے گا'۔

'کل تک صبر نہیں کر سکتا'۔

'حسین اس وقت سو رہے ہیں۔ انہیں سخت بخار تھا اور اپنی خبر بھی نہیں تھی'۔

حسن مسکرائے' حسین اور سو جائیں! اور وہ بھی اس وقت جب انہوں نے اپنے سپاہی ایسے آپریشن کے لئے بھیج رکھے ہوں! مجھے یقین ہے کہ اگر انہیں چالیس ڈگری بخار بھی ہو اتب بھی وہ جاگ رہے ہیں'۔

حسن کو واپس کرنا ناممکن تھا۔ گاڑی تک پیدل آئے۔ سوار ہوئے اور ہیڈ کوارٹر پہنچ گئے۔ حسن غلط نہیں کہہ رہے تھے۔ حسین جاگ رہے تھے اور ہمارا راستہ دیکھ رہے تھے۔

'کیاہوا؟ مشن پوراہوا'؟

'اس سے اچھا نہیں ہو سکتا تھا'

'خدا کرے نتیجہ بھی اچھا ہو'۔

'ایسا ہی ہو گا۔ محمود جس باریک بینی سے کام کر رہے تھے اس سے تو لگتا ہے کسی کا پل پر سے صحیح و سالم گذر جانا ممکن نہیں ہے۔اس حساس موقع پر جب عراقی بالکل سر پر آن کھڑے ہوتے یہ جھاڑو لگائے بغیر وہاں سے نہیں اٹھے'۔

حسین کے لبوں پر دلکش مسکراہٹ بکھری 'خدا آپ لوگوں کو سلامت رکھے۔افسوس کہ میں آپ لوگوں کے ساتھ نہیں آسکا'۔

قدوسی بولے 'آپ بہت کام کرتے ہیں حسین! اگر آپ کو اپنی فکر نہیں ہے تو کم سے کم ہماری ہی فکر کر لیجئے۔انسان کو آرام کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ مشین تو نہیں کہ جتنا بھی دوڑ بھاگ کرے اسے کچھ بھی نہ ہو'۔

حسین نے جواب دیا' دیکھو کون مجھے سمجھا رہا ہے! اگر ایسا ہی ہے تو آپ خود کیوں کہیں رکتے اور آرام نہیں کرتے؟ اور مجھے کیا ہوا ہے سردی لگ گئی تھوڑا نزلہ زکام ہو گیا ہے کل کی بارش کی وجہ سے'۔

اس کے بعد اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں اور آخر میں بات نکلی حسین کے اہواز جانے کی۔

'ہاں بھائی کیا ہوا تھا؟ آپ کو کیوں بلایا گیا تھا'؟

'فوج ایک بڑا آپریشن کرنا چاہتی ہے۔ ہمیں بھی ہر لحاظ سے تیار رہنا چاہیئے'۔

'ہماری ذمہ داری معین ہو گیا ہے'؟

'نہیں، اگر کوئی ذمہ داری ہمیں دیں گے بھی تو زیادہ امکان ہے کہ ہم پیادہ فوج یا لائٹ انفینٹری کے بطور کام کریں گے'۔

'یعنی ابھی یہ معین نہیں کہ آپریشن میں ہمارا بھی کوئی کردار ہو گا یا نہیں'؟

'نہیں۔ لیکن آج کی میٹنگ میں معین ہو جائے گا۔ سب سے کہہ دیجئے یہیں رہیں کوئی اہوازو غیرہ نہ جائے'۔

'بسر و چشم'۔

مزید کچھ دیر باتیں ہوتی رہیں اس کے بعد ہم لوگ نماز فجر کی تیاری کرنے لگے، اذان ہونے ہی والی تھی۔ نماز کے بعد ہم لوگ وہیں تھوڑی دیر آرام کرنے کے لئے لیٹ گئے۔ ابھی ٹھیک سے نیند آئی ہی ہو گی کہ ایک زوردار دھماکہ نے چونکا دیا۔ اس وقت دھماکہ! مجھے تعجب سا ہوا۔ عراقی شہر اور اس کی نواحی علاقوں پر مستقبل گولہ باری کر رہے تھے لیکن اس دن تک ایسا نہیں ہوا تھا کہ صبح اتنی جلتی کسی فائر کی آواز آئے بلکہ صبح کے وقت تو ایسا لگتا تھا جیسے غیر اعلانیہ جنگ بندی ہو گئی ہو۔ اور یہ کوئی غیر معمولی بات بھی نہیں تھی اس لئے کہ اتنی ٹھنڈک میں صبح صبح عراقیوں میں کہاں ہمت جو گولہ باری کرنے لگیں اور ایسا کرنا ان کے لئے ضروری بھی نہیں تھا اس لئے کہ جب دل چاہتا تھا فائر شروع کر دیتے تھے۔

نیند تو اڑ چکی تھی۔ باہر آکر دیکھا صبح کی روشنی پھیل چکی تھی اور چاروں طرف ہلکا سا کہرا تھا۔ میں نے سنتری سے پوچھا 'آپ کو بھی دھماکہ کی آواز سنائی دی'؟

'ہاں'۔

'تو میں ٹھیک سمجھا تھا۔ کس طرف سے آواز آئی تھی'؟

'دریا کی طرف سے'۔

'توپ کی آواز تھی'؟

'مجھے نہیں لگتا'۔

کچھ دیر بعد حسین جس میٹنگ کا کہہ رہے تھے اس میں شرکت کے لئے سوسنگر روانہ ہو گئے۔ سورج نکلا تو کہرا بھی جاتا رہا اور حسن جو ابھی گاؤں کے لئے نکلے تھے واپس ہیڈکوارٹر آ گئے اور خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔

'پتہ چلا'؟

'کس بات کا'؟

'پل اڑ گیا ہے'۔

سب آ کے ان کے گرد حلقہ زن ہو گئے۔میں نے پوچھا 'واقعاً؟ تو وہ صبح کا دھماکہ۔۔۔'۔

'ہاں وہ پل ہی کے اڑنے کی آواز تھی'۔

'بارودی سرنگ پر کیا چیز آئی کچھ پتہ چلا'؟

'ہاں! مجھے حاج غالب کے باشندوں سے پتہ چلا ہے'۔

'کیا'؟

'دشمن کے سپاہیوں سے بھرا ٹرک بارودی سرنگ سے ٹکرایا ہے'۔

'اللہ اکبر کی آواز گونجنے لگی'۔

'کوئی مرا بھی ہے'؟

'ہاں! سنا ہے کہ بیس سے زیادہ فوجی ہلاک ہو گئے ہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ ٹرک کے پیچھے پیچھے آرہی ایک جیپ اور لوڈر بھی اڑ گئی ہے'۔

اب ہماری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہا۔(شاید یہ دشمن پر سب سے کاری ضرب لگی تھی۔ لیکن اتنا ہی نہیں حاج غالب گاؤں کا پل منہدم کر کے ہم نے اور بھی فائدے اٹھائے۔ ایک طرف حسین نے اس واقعہ کے ذریعہ اعلیٰ فوجی حکام کے سامنے ہماری صلاحیتیں ثابت کیں جس کے نتیجہ میں انٹیلیجنس کا پورا کام ہمارے حوالہ کر دیا گیا۔ دوسری طرف آپریشن کے پہلے ہی دن یعنی پانچ فروری کو جب ہمدان بریگیڈ نے سوسنگرد کی طرف سے اپنا کام شروع کیا تو عراقی بغیر کسی مزاحمت کے عقب نشینی کرتے گئے یہ سوچ کر کہ حاج غالب پل سے گذر کر جان بچالے جائیں گے۔ لیکن انہیں کیا پتہ وہ شاخ ہی کٹ چکی جس پر آشیانہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انقلاب محافظ لائٹ انفینٹری اور فوج کے ٹینکوں سے سامنا ہو گیا اور اس وقت ان کی بد قسمتی اپنے عروج کو پہنچ گئی جب قزوین بریگیڈ بھی ہم سے مل گئی)۔

بہر حال میں سلسلہ سے سارے واقعات سنانا چاہتا ہوں اور انشاء اللہ آخر تک یہی کوشش کروں گا۔

اس دن حسین نے میٹنگ سے واپس آنے کے بعد کہا 'آپ لوگوں کے لئے خوشی کی خبر ہے '۔ ایک دن میں دو خوشخبریاں سننے کا موقع مل رہا تھا۔

'ہماری ذمہ داری معین کر دی گئی ہے۔ طے پایا ہے کہ انقلاب محافظ کے تین سو سپاہی پیادہ فوج کے طور پر آپریشن میں حصہ لیں گے '۔

'تو آپریشن یقینی ہے '؟

'ہاں! فوج کی ایک بریگیڈ سوسنگرد کے شمال میں اور دوسری ہویزہ کے جنوب میں ٹھکانہ بنا چکی ہے۔ پہلا مقصد حمید کوارٹر پر قبضہ ہے اور دوسرا مقصد خرم شہر کی بازیابی ہے۔ یہ ہماری افواج کا پہلا بڑا آپریشن ہے '۔

'آپ نے کہا تین سو؟ لیکن ہم تو صرف باسٹھ ہیں '۔

'صحیح ہے لیکن بہت سے رضا کار اہواز آ چکے ہیں۔ اصفہان اور مسجد سلیمان سے تعلق رکھنے والے رضا کار ہویزہ پہنچ رہے ہیں'۔

'اسلحہ وغیرہ'؟

'زیادہ کچھ ملنے کی امید نہیں ہے لیکن شاید آر، پی، جیز کی تعداد دو سے بڑھ کر چھ سات ہو جائے'۔

'ہمیں کہاں ٹھکانہ بنانا ہو گا'؟

'ہم قزوین بریگیڈ کے ساتھ دریائے کرخہ کے کنارے مورچہ زن ہوں گے اور جب آپریشن شروع ہو جائے گا تو ابوسعد کی طرف آگے بڑھیں گے۔ ہمدان بریگیڈ بھی سوسنگرد میں دشمن کے ٹھکانوں پر یکے بعد دیگرے قابض ہونا شروع ہو گی اور پھر حاج غالب گاؤں کے پاس ہم سے اور قزوین بریگیڈ سے ملحق ہو جائے گی۔ پھر یہاں ہم آپریشن کے اگلے مرحلہ کا انتظار کریں گے'۔

'یعنی ہویزہ سے دو کلو میٹر کی دور پر'۔

'ہاں! بالکل'۔

محمود بولے 'ہماری ایک آر، پی، جی خراب ہے اور اکیس افراد کے پاس کوئی اسلحہ نہیں ہے'۔

حسین نے بتایا 'اسلحہ کے لئے میں نے درخواست دے دی ہے جلد ہی پہنچ جائے گا۔ یاد رکھئے گا جنگ شروع ہونے کے بعد یہ پہلا بڑا آپریشن ہے۔ مجھے آپ میں سے ہر فرد کی قربانی کی ضرورت ہے۔ اگر کسی میں سکت نہیں یا حملہ میں شرکت نہیں کرنا چاہتا تو ابھی سے بتادے تاکہ اس کی جگہ دوسرا کوئی رضا کار رکھ لیا جائے۔ رضا کار بہت ہیں۔ ایک دو گھنٹے بعد ہماری امداد کرنے والے رضا کار پہنچ جائیں گے'۔

ساتھیوں کی آوازیں آنے لگیں 'کیا کہہ رہے سید! ہم ہفتوں سے آپریشن کا انتظار کر رہے ہیں۔ اس میں شرکت ہم سب کی دلی تمنا ہے'۔

ایک گھنٹہ بعد اصفہان کے رضا کار بسوں میں سوار آپہنچے۔ اچھی خاصی مقدار میں ہتھیار اور بڑی تعداد میں وردیاں بھی آگئیں۔

حسین کو جیسے سر کھجلانے کی فرصت نہ ہو۔ مستقل دوڑ بھاگ! میں نے کہا 'آنے والی رات سخت ہو گی، تھوڑا آرام کر لیجئے'۔

'آرام؟! آرام بہت ہو چکا، اب کام کی باری ہے۔ آر، پی، جیز چیک کیں'؟

'قدوسی نے چیک کی ہیں، سب ٹھیک ہیں'۔

'گاڑی بھی دیکھ لیجئے! اندھیرا ہوتے ہی پہلی ٹکڑی روانہ کر دی جائے گی'۔

'وہ کہاں رکے گی'؟

'ہویزہ سے دو کلو میٹر دور'۔

اس کے بعد آپ اہواز فون کرنے اپنے کمرہ میں چلے گئے۔ بڑے شوق سے جلدی جلدی سارے کام نپٹا رہے تھے۔ مجھے وہ دن یاد آ گیا جب ہم سوسنگرد گئے تھے۔ شہر پر شدید گولہ باری ہو رہی تھی اور ہر طرف سے دھویں اور گردو غبار کے بادل اٹھ رہے تھے۔ گولے ہمارے آس پاس گرتے اور ان

کے ٹکڑے چھرے اڑنے کی آواز مستقل آتی رہتی۔ وہ سامنے دیکھ رہے تھے جیسے انہیں کوئی خاص چیز دکھائی دے رہی ہے جو دوسرے نہیں دیکھ سکتے۔

ہم لوگ سڑک کے درمیان تھے، میں چلایا 'حسین گولہ باری شدید ہے آؤ کہیں پناہ لے لیتے ہیں'۔ لیکن انہوں نے شاید میری آواز سنی ہی نہیں تھی۔ پھر مجھے محسوس ہوا کہ جیسے کسی باتیں کر رہے ہوں۔ کس سے؟ کوئی دکھائی نہیں دیا۔ میں نے تعجب سے ان کے چہرہ کی طرف دیکھا اور غور سے سننے کی کوشش کی تو کہہ رہے تھے 'کیوں یہاں؟ کیوں وہاں؟ سیدھے میرے سامنے کیوں نہیں گرتے؟ ادھر ادھر کیوں جا رہے ہو'؟

تعجب ہوا اور مجھے دیر میں سمجھ میں آیا کہ وہ مارٹر کے گولوں سے بات کر رہے اور ان سے کہہ رہے تھے کہ سیدھے ان کے سامنے آکر گریں۔۔۔'۔

سورج ڈھل گیا۔ ہیڈ کوارٹر میں تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی۔ نماز میں بھی عجب کیفیت تھی۔ ایک مولانا بھی آئے تھے اور انہوں نے بڑی ولولہ انگیز تقریر کی۔ اس کے بعد حسین نے مجھ سے پوچھا 'گاڑی تیار ہے'؟

میں نے کہا‘ہاں سید’!

اور وہ اصفہانی رضاکاروں کی طرف چلے گئے۔ وہ لوگ گاڑیوں پر سوار ہونے کے لئے اپنا سامان باندھ رہے تھے۔ان کے کمانڈر نے حسین کو دیکھ کر کہا ‘سردی ہے’۔

آپ نے مذاق میں جواب دیا‘ابھی ٹھیک ٹھاک آگ جلے گی، گرم ہو جائیں گے۔ساتھیوں کو پوری طرح سب کچھ سمجھا دیا ہے’؟

‘تقریباً! انہیں پتہ ہے کہ سڑک پر دائیں طرف کھڑے ہوں گے۔باقی تفصیلات وہیں بتائی جائیں گی’۔

‘اگر آپ لوگ تیار ہیں تو ہم بھی آپ کے ساتھ آرہے ہیں’۔

ہم لوگ گاڑیوں پر سوار ہوئے اور لائٹیں بند کر کے چل پڑے۔چاند نکل رہا تھا اور تقریباً چودھویں کے جیسا تھا۔ مطلع بدستور ابر آلود تھا اور ہور کی طرف سے سرسر ہوائیں چل رہی تھیں۔ حسین نے آر، پی، جی پیروں کے درمیان

رکھی تھی اور سڑک کی طرف دیکھ رہے تھے۔ میں نے کہا' کچھ سوچ رہے ہیں سید'؟

کہنے لگے' جب میں ہویزہ آیا تو میں نے سوچا تھا کہ جتنا میں نے قرآن اور نہج البلاغہ سے سیکھا ہے اس پر عمل کروں گا۔ اب احساس ہو رہا ہے کہ اجرت لینے کا وقت نزدیک ہے اور جلدی ہی اس کا اجر مل جائے گا'۔

لہجہ عجیب سا تھا، نہیں معلوم دل پر کیا گذر رہی تھی لیکن مجھے احساس ہوا کہ اب آپ آہستہ آہستہ خدا سے خلوت میں غرق ہوتے جا رہے ہیں جو اس سے پہلے نظر نہیں آیا تھا۔

منزل پر پہنچ گئے، گاڑیوں سے اترے۔ حسین نے سب کو سڑک کے کنارہ اکٹھا کیا۔

'ہم اس وقت ہویزہ سے دو کلو میٹر کے فاصلہ پر ہیں۔ ہمارے سامنے سوسنگرد اور دریائے کرخہ ہے۔ بائیں جانب نہر نیسان اور پھر ہور الہویزہ ہے اور دائیں طرف حمیدیہ ہے۔ کچھ عرصہ پہلے دشمن کے یہاں کوئی خاص مورچے نہیں

تھے لیکن اب کئی جگہوں پر اس نے مورچے تعمیر کر لئے ہیں۔ انشاء اللہ کل صبح آپریشن شروع ہو جائے گا'۔

اس وضاحت کے بعد حسین نے رضاکاروں کو مختلف جگہوں پر تعینات کرنے میں کمانڈر کی مدد کی۔ سب کی جگہیں تھوڑا تھوڑا فاصلہ کے ساتھ معین کر دی گئیں اور وہ اپنے لئے پناہ گاہ کھودنے میں لگ گئے۔

اس کے بعد ان کے کمانڈر نے انہیں کچھ حفاظتی اقدامات بتائے اور تقریباً ایک گھنٹہ بعد میں اور حسین مسجد سلیمان کے رضاکاروں کو لانے کے لئے چلے گئے تاکہ انہیں بھی ان کی جگہ پر تعینات کر دیا جائے۔ ان کے کمانڈر کا نام برادر کریم تھا۔ ایک گھنٹہ ہم ان کے ساتھ رہے اور اس کے بعد تہران، سبزوار اور دزفول کے رضاکار بھی پہنچ گئے اور انہیں ہم نے دو اصلی ٹکڑیوں سے ملحق کر دیا۔

ہمارا کام ختم چکا تھا۔ رات تقریباً ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ میں تھکن سے چور ہو گیا تھا جبکہ رات میں اچھا خاصا آرام بھی کیا تھا تو سوچئے حسین کا کیا حال رہا

ہو گا۔ میں نے ان کے چہرہ کی طرف دیکھا تھکن کے آثار صاف دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے کہا کافی تھک چکے ہیں، آرام کیجئے۔ آپ نماز صبح سے پہلے جاگ گئے تھے اور تب سے مستقل دوڑ بھاگ کر رہے ہیں'۔

مسکرائے وہی ہمیشہ کی مسکراہٹ 'کیا آج کی رات ہاتھ سے جانے دوں'۔

سنسان اور اندھیری سڑکوں سے گذرتے ہوئے ہم لوگ ہیڈ کوارٹر آ پہنچے۔ ابھی گاڑی سے اترے نہیں تھے کہ ایک ساتھی کی آواز سنائی دی 'سید واپس آگئے، سید واپس آگئے'۔

کوئی سویا نہیں تھا سب ان کی راہ تک رہے تھے۔ جب گاڑی سے اترے تو ساتھیوں نے ان کے گرد حلقہ بنا لیا جیسے ان سے بچھڑے کئی دن ہو گئے ہوں۔ ان کی نگاہوں میں عجیب سی محبت تھی۔ قدوسی حسین کو اپنے کمرہ میں لے گئے۔ سب وہیں اکٹھا ہو گئے۔ قدوسی نے پوچھا 'کھانا کھایا'؟

'نہیں'۔

غفار درویشی اٹھے ' ابھی آپ لوگوں کے لئے کچھ لے کر آتا ہوں ' اور تھوڑی دیر میں دو تین ابلے انڈے اور کچھ روٹیاں لے آئے۔ میں اور حسین کھانا کھانے لگے۔ سپاہیوں میں عجیب جوش و ولولہ تھا؛ ہنس کھیل رہے تھے، مذاق کر رہے تھے۔ ان کے لئے بھی وہ بہت خوشی کی رات تھی، اگرچہ انہوں نے دن میں بہت کام کیا اور ڈھیر سارا سامان ڈھویا تھا لیکن جیسے تھکن کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ حسین کے پرانے دوست پروانہ وار ان کے گرد حلقہ زن تھے؛ یونس شریفی، جمال دہ شور، قاسم نیسی، حسن بوغدار، حسین احتیاطی وغیرہ ---

تاریخی رات تھی وہ کبھی نہیں بھول سکتی۔ ایسا لگ رہا ہے کہ جیسے وہ سب پیارے پیارے ساتھی میرے آنکھوں کے سامنے ہیں جبکہ ان میں سے اکثر اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ کوئی وصیت لکھ رہا تھا، کوئی ہتھیار صاف کر رہا تھا، کوئی سامان باندھ رہا تھا۔ ہم اسی طرح باتیں کر رہے تھے کہ حسین بولے 'بھائیو! گرم پانی ہے'؟

'کیا کرنا ہے'؟

'نہانا چاہتا ہوں'۔

'اس سردی میں!۔۔۔ کل آپریشن ہے بہت دھول اڑے گی، سر، گردن، کپڑے سب بھر جائیں گے'۔

'جانتا ہوں'۔

'پھر بھی نہائیں گے؟ تہران جانا ہے کیا'؟

حسین ہنسنے لگے، خوب ہنسے! اتنا کہ ہم سب بھی ہنسنے لگے۔اس کے بعد خاموش ہوئے اور کہنے لگے 'کل تہران نہیں جارہا ہوں، اس سے اہم جگہ جا رہا ہوں'۔

'کہاں'؟

'خدا سے ملنے'۔

اچانک کمرہ میں خاموشی چھاگئی۔ یہ جملہ انہوں نے پورے اطمئنان سے کہا تھا۔ سب ٹکٹکی باندھے انہیں دیکھے جارہے تھے، کسی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کیا کہے۔ ایک دوسرے کی طرف اٹھنے والی سوالیہ نظریں اس کی غماز تھیں۔ غفار نے ہمت کر کے خاموشی توڑی۔

'دیکھیں کیا ہو سکتا ہے' کہہ کے باہر نکل گئے۔ تھوڑی دیر بعد واپس آکر بتایا 'نہانے بھر کا گرم پانی نہیں ہے'۔

'کتنا ہے'؟ حسین نے پوچھا۔

'ایک کیتلی'۔

'وہی ٹھیک ہے کم سے کم سر تو دھولوں گا'۔

غفار دوبارہ باہر گئے اور ایک کیتلی گرم پانی اور ایک پلاسٹک کا ایک تشت لے آئے۔ حسین اٹھ کھڑے ہوئے۔

'باہر ہی دھولیتا'۔

'نہیں باہر سردی ہے'۔

حسین تشت کے پاس بیٹھے۔ ایک ساتھی آگے بڑھے اور بولے 'میں پانی ڈالتا ہوں' لیکن غفار نے کیتلی نہیں دی۔ گویا حسین کے سر پر پانی ڈالنے کی سعادت سے محروم نہیں ہونا چاہتے تھے۔ حسین نے تشت کے پاس سر جھکایا۔ غفار نے آہستہ آہستہ پانی ڈالنا شروع کیا۔ ہم حلقہ بنائے بیٹھے انہیں دیکھ رہے تھے۔

اس کے بعد حسین نے رومال سے سر خشک کیا اور چہرہ پر وہی حسین مسکراہٹ۔

'جتنے نئے کپڑے ہیں سب لے آیئے'۔

'کس لئے'؟

'کپڑے بدل لیجئے'۔

'ابھی ہمارے کپڑے پھٹے نہیں ہیں'۔

'کوئی بات نہیں'۔

ایک دو لوگ گئے اور کپڑوں کا بیگ اٹھا لائے۔ سب نے نئے کپڑے پہنے۔ یہ پانچ جنوری ۱۹۸۱ کی رات تھی تقریباً ڈیڑھ بج چکا تھا۔ حسین نے کہا' جایئے صبح تک آرام کیجئے'۔

ہم لوگ اپنے کمروں میں چلے گئے۔

صبح میں کہرا تھا لیکن پتہ تھا کہ سورج نکلتے ہی کہرا چھٹ جائے گا۔ حسین نے رومال گردن کے گرد لپیٹ رکھا تھا۔ ناشتہ کے بعد ہم چلنے کے لئے تیار ہو چکے تھے۔ اب ہم دفاعی لائن کی طرح رواں تھے تھوڑا آگے جانے کے بعد میں حسین اور باقی لوگ جو ایک ہی گاڑی میں تھے فوج کے ہیڈ کوارٹر کی طرف چلے گئے۔ حسین کمان کے مورچہ کے سامنے گاڑی سے اترے اور اندر چلے گئے۔ انہیں وہاں دو کام تھے ایک وائرلیس لینا تھا اور ایک فوج کے افسران سے آخری امورات طے کرنا تھے۔

وہ واپس آئے تو ہم لوگ بھاگتے ہوئے باقی ساتھیوں کے پاس پہنچے۔ سب اپنی جگہ پوزیشنیں سنبھالے تھے۔ حسین ہم سے الگ ہوگئے اور طلایہ پھر کے سارے سپاہیوں کا جائزہ لینے لگے۔ واپس آئے تو وقت آٹھ سے اوپر ہو چکا تھا۔ بولے 'تیار ہو جایئے۔ حملہ شروع ہونے میں تھوڑی ہی دیر ہے'۔ اس کے بعد سامنے صحرا پر نظریں دوڑانے لگے۔ کہرا چھٹ چکا تھا، سورج ہماری پشت پر چمک رہا تھا اور لق و دق صحرا تاحد نگاہ دیکھا جا سکتا تھا۔ کہیں کوئی درخت یا پناہ کی جگہ نظر نہیں آ رہی تھی بس تیس چالیس سینٹی میٹر کی خاردار جھاڑیاں جا بجا اگی ہوئی تھیں۔ چاروں طرف ایک پراسرار خاموشی تھی۔ تھوڑا آگے ایک چیل گھوم گھوم کے اڑ رہی تھی اور بہت دور سفید بادل کے چند ٹکڑے زمین پر سایہ کئے ہوئے تھے۔

میں نے کہا' اس خاموشی پر آپ کو کچھ شک سا نہیں ہو رہا ہے'؟

'کیسے'؟

'عراقیوں کی طرف سے کوئی فائر نہیں ہو رہا ہے ایسا تو نہیں کہ ہمارے انتظار میں بیٹھے ہوئے ہیں'؟

'آمد و رفت بڑی احتیاط سے ہوئی ہے۔ مجھے نہیں لگتا کہ عراقیوں کو ذرا سا بھی پتہ چلا ہو اور نہ ہی انہیں اس کی امید ہو گی۔ میرا خیال ہے کہ اس اچانک پر حملہ بوکھلا جائیں گے'۔

اتنے میں وائرلیس والا دوڑتا ہوا حسین کی طرف آتا دکھائی دیا۔ ہم لوگوں نے اسے معنی خیز نظروں سے دیکھا تو بولا 'آپریشن کوڈ کا اعلان کر دیا گیا ہے'۔

میں نے حسین کی طرف دیکھا تو آپ کی زبان پر تھا 'بسم اللہ الرحمٰن الرحیم' اور آر، پی، جی کو مضبوطی سے تھام لیا۔

'چلو میرے عزیزو'!

ان کی آواز میں بلا کا بھاری پن تھا۔ میں نے کلاشنکوف میں گولیاں بھریں اور سب اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ حسن صبح تڑکے چلے گئے تھے انہوں نے بتایا تھا کہ دشمن معمول کے مطابق اپنے کام میں لگے ہیں لہٰذا اس اچانک

حملہ پر ان کی بوکھلاہٹ تقریباً یقینی تھی اور اسی لئے طے پایا تھا کہ ہم خاموشی سے ان کے نزدیک پہنچیں۔

دشمن کے ٹھکانوں سے پانچ سو میٹر کی دوری پر بالکل خاموشی تھی اور کسی طرح کی کوئی آواز نہیں آ رہی تھی بس اگر کوئی آواز تھی تو ہمارے چلنے کی، ہتھیاروں کے کھٹکنے کی، سوکھے کانٹے ٹوٹنے کی اور دل دھڑکنے کی۔ اور یہ آوازیں مجھ پر بار ہو رہی تھیں۔اس کے بعد اچانک ہمارے سامنے سے فائرنگ کی آواز گونجی۔ حسین برق رفتاری وائرلیس کے پاس پہنچے اور پھر میں نے انہیں یہ کہتے سنا:

'انہیں ہمارا پتہ چل گیا ہے۔۔۔ توپ خانہ۔۔۔ توپ خانہ۔۔۔ کرنل راد فر آپ میری آواز سن رہے ہیں'؟

کچھ ہمارے سروں پر سے گذرے اور کچھ ہمارے نزدیک آ گرے۔ ہم نیم ایستادہ حالت میں ہو گئے۔ تھوڑی ہی دیر میں ہماری افواج کی طرف سے فائرنگ شروع ہو گئی۔ قزوین بریگیڈ کے ٹینک بھی غرانے لگے۔ گولے

سنسناتے ہمارے سروں سے گذر کر عراقیوں کی طرف جا رہے تھے اور عراقیوں کے ٹھکانوں سے دھواں اور گردو غبار اٹھ رہا تھا۔ جھاڑیوں میں آگ لگ گئی، کانٹے جلنے لگے اور زمین پر جیسے ہل چل گیا ہو۔ میں بھاگا جا رہا تھا۔ کبھی حسین آر، پی، جی والوں کو پراکندہ ہونے کا حکم دیتے سنائی پڑتے، کبھی خود فائر کرتے دکھائی دیتے، یا چلا رہے ہوتے اور طبی امداد والے کو کسی زخمی کے مدد کے لئے پکار رہے ہوتے، کبھی دوڑتے، کبھی اچھلتے۔ یہ سب میں اتنے قریب سے دیکھ رہا تھا کہ یقین نہ آئے کہ یہ حقیقت ہے یا فلم۔ ہوا مغرب سے مشرق کی طرف چل رہی تھی اور عراقیوں کے ٹھکانوں سے اٹھنے والے دھواں اور گردو خاک ہماری طرف بھی لا رہی تھی جس کے نتیجہ میں مجھے جو بھی شے دکھائی دیتی ٹکڑے ٹکرے یا اس کا صرف کچھ حصہ دکھائی دیتا۔ دھویں اور گردو غبار میں ایک شخص میرے پاس سے گذرا قدوسی تھے میں نے انہیں ان کی فولڈنگ جی۔۳ سے پہچان لیا۔ کوئی چلایا‘اس طرف! اس مورچہ سے فائر ہو رہا ہے مارو اسے ’! تو میں نے حکیم کی ایک جھلک دیکھی۔ کوئی

چلایا'میزائل! مجھے میزائل چاہیئے' چلانے والے غفار تھے، ان کی بھی ایک جھلک نظر آئی۔۔۔

جب ہم دشمن کے ٹھکانہ پر پہنچے تو دیکھا کہ انہوں نے صرف ایک میگزین خالی کیا تھا۔ آپریشن کے شروع میں توپ خانہ (آرٹلری) کا نشانہ عراقیوں کا اگلا مورچہ تھا لیکن اب ان کے ٹینک اور گاڑیاں وغیرہ نشانہ پر تھیں تاکہ انہیں بالکل مفلوج کر دیا جائے۔ دشمن کا اگلا مورچہ خالی ہو چکا تھا جو بچ گئے تھے ان کے بھی ہاتھ اوپر تھے۔ کچھ مورچوں میں ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ جلے ٹینک اور گاڑیاں جگہ جگہ دکھائی دے رہی تھیں۔ دائیں طرف ایک گن جیپ ۱۰۶ جل رہی تھی لیکن لگ رہا تھا کہ آگ صرف ٹائروں کو لگی ہے اور خود گن محفوظ ہے۔ پتہ نہیں ایسا ہی تھا یا مجھے ایسا لگ رہا تھا۔ میرا دل چاہا کہ اس کی آگ بجھا کر اس کا رخ عراقیوں کی طرف موڑ دوں۔

مجھے ابھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ ہم نے عراقیوں کا اگلا مورچہ تباہ کر دیا ہے۔پشتہ کے اندر سے حسین کی آواز آئی'اگر کوئی خود سپردگی کرنا چاہتا ہے تو اسے موقع دیجئے۔ آگے آنے دیجئے'۔

'قیدیوں کو ایک جگہ اکٹھا کیجئے'۔

وائرلیس والے نے سیٹ حسین کے حوالہ کیا۔ آپ کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا تھا اور ہمارے کہنے پر دوبار خبر سنائی۔

'علومی اور حاج بدر گاؤں کے نزدیک دشمن کا اصلی محاذ بغیر کسی مزاحمت کے فتح ہو گیا ہے'۔

ان لمحات میں ہم صرف خدا کا شکر ہی ادا کر سکتے تھے۔ اگر وہ نہ چاہتا تو کیا سر سے پیر تک لیس عراقیوں کو اتنی آسانی سے خود سپردگی پر آمادہ کیا جا سکتا تھا؟

'سارے مورچوں کی تلاشی لیجئے۔ اگر کوئی چھپا ہوا ہے تو اسے باہر کھینچ لایئے تاکہ ان سب کو پیچھے بھیجا جائے'۔

وائر لیس ایک لمحہ کے لئے بھی خاموش نہیں ہو رہا تھا اور حیرت انگیز کامیابیوں کی خبریں سنائے جارہا تھا۔ ہمدان بریگیڈ سوسنگرد کے پاس سے چلی اور حاج غالب کے نزدیک بھاگ رہے عراقیوں کو دھر دبوچا۔

حسین نے اعلیٰ کمان سے رابطہ کیا۔

'ہم دوسرے پشتہ کی طرف جانا چاہتے ہیں۔ بھاری گولہ باری کی ضرورت ہے۔ ایسا کریے کہ عراقی سر نہ اٹھا سکیں'۔

دوسری طرف سے تعاون کا یقین دلایا گیا اور ہم انتظار کرنے لگے۔ جب معینہ سمت میں گولہ باری ہونے لگی تو ہم بھی آگے بڑھے۔ دوسرا محاذ تو پہلے سے بھی آسانی سے فتح ہو گیا۔ ایک ٹینک جو مزاحمت پر اڑا تھا ہمارے آر، پی، جی گولہ کا نشانہ بن کر نذر آتش ہو گیا اور فوجی فی الفور سپر انداختہ ہو گئے جیسے کسی بہانہ یا اشارہ کے منتظر ہوں۔

اس کے بعد قزوین بریگیڈ کے ٹینک بھی آ پہنچے اور عراقیوں کے بنائے پشتہ کے اندر صف آراء ہو گئے۔ یہاں پر حسین اور ان کے پرانے رفقاء کو ملنے کا موقع مل گیا۔

'سلامت رہئے سید'!

'آپ بھی سلامت رہئے'۔

'حمید کو ارٹر کب چلنا ہے'؟

'فی الحال یہیں رکنا ہے'۔

'طے نہیں تھا کہ حمید کو ارٹر فتح ہونے تک آپریشن جاری رہے گا'؟

'ہاں ایسا ہی تھا لیکن برادران یہ کام کل کرنا چاہتے ہیں'۔

'تو آج کا ہمارا کام ختم ہو گیا'؟

'ہاں! آپ لوگ اپنا مورچہ بنا لیجئے اور پوزیشن سنبھال لیجئے'۔

کسی کی آواز آئی' ابھی تو دو ہی بجے ہیں۔ کل تک بیکار پڑے اکتا جائیں گے'۔

'ہمارا آپریشن آٹھ گھنٹے چلنا تھا۔ اور وہ بھی یہ کہ ہم آٹھ گھنٹے میں ہویزہ سے دس کلو میٹر دور ابو سعد پہنچیں گے نہ کہ یہاں۔ لیکن آپ لوگوں نے دیکھا کہ ہم ایک ہی گھنٹہ میں ابو سعد پہنچ گئے۔ مال غنیمت اور قیدی توقع سے کہیں زیادہ ہیں لہٰذا تھوڑا صورتحال قابو میں آنے دیجئے'۔

'قیدی کتنے ہیں'؟

'مجھے جو بتایا گیا ہے اس کے مطابق ابھی تک نو سو سے زیادہ گنے گئے ہیں'۔

'تو آج ہم یہیں ہیں'؟

صحرا کی طرف بغور دیکھتے ہوئے جواب دیا' ہاں! آپریشن کا پہلا مرحلہ مکمل ہو چکا ہے۔ کیا یہ ظاہر یہ نہیں ہے'؟

پلٹ کر حسن کو دیکھا لیکن لہجہ سے لگ رہا تھا کہ وہ پوچھ نہیں رہے بلکہ کسی بات پر تاکید کرنا چاہتے ہیں۔

حسن نے جواب دیا'ہاں طاہر یہ ہی ہے۔رات میں دوسری طرح کا دکھائی دیتا ہے'۔

حسین کے منہ سے نکلا'تعجب ہے'!اور دوبارہ صحرا کو دیکھنے لگے۔

اس دن ہمارا لشکر وہیں رکا۔طے پایا کہ اگلے دن آپریشن کا دوسرا مرحلہ شروع ہو گا اور اگر کامیاب رہا تو خرم شہر کی بازیابی تک جاری رہے گا۔یہ خبر سن کر ساتھی بے چین ہو گئے اور بے صبری سے کل کا انتظار کرنے لگے۔رات میں بہت سردی پڑی۔ حسین نے اپنے دوست (حسین احتیاطی) سے عاریتاً لی ہوئی قمیض وردی کے نیچے پہن لی۔رہنے کے لئے پورے انتظامات نہیں ہو سکے تھے اور عراقی بھی لگ نہیں رہا تھا کہ اتنی جلدی جوابی کاروائی کے اہل ہوں گے۔لہٰذا طے پایا کہ کچھ سپاہی وہیں رہیں اور کچھ اطراف کے دیہاتوں میں چلے جائیں۔

ہماری اکلوتی وانٹ کا سامنے کا شیشہ ٹوٹ گیا تھا۔جب ہم ایک گاؤں کی طرف جا رہے تھے تو باہر کی ٹھنڈی ہوا پوری اندر آ رہی تھی۔ابھی چلے ہی تھے کہ

راستہ میں ایک شخص دکھائی دیا، چہرہ جانا پہچانا سا لگ رہا تھا۔ حسین نے گاڑی روکی اور اتر گئے، چلا وہی رہے تھے۔ وہ شخص حاجی شویش تھے حسن کے رشتہ دار۔ وہ کچھ عرصہ پہلے رضاکار ملیشیا میں شامل ہوئے تھے اور اس دن آپریشن میں بھی شریک تھے۔ حاجی صاحب نے حسین کو دیکھتے ہی گلے لگالیا اور بولے 'مبارک ہو سید! اس بڑی کامیابی پر ہم سب خوش ہیں'۔

'اپنے آپ کو مبارکباد دیجئے۔ آپ اور حسن جیسے افراد کے بغیر ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے اور یہ تو ابتداء ہے اصل کامیابی ابھی بہت دور ہے۔ اصل کامیابی تب ہو گی جب ہم غنیمت میں حاصل شدہ انہیں ٹینکوں کے ذریعہ عراق کے مظلوم عوام کو ان کافر بعثیوں سے نجات دلائیں گے اور کربلائے معلیٰ کی سرزمین پر قدم رکھیں گے'۔

حاجی صاحب بہت خوش ہوئے۔ گھر کا حال چال معلوم کرنے جارہے تھے، ہم لوگوں نے انہیں بھی اپنے ساتھ گاڑی پر بٹھالیا'۔

صبح تڑکے اپنے ٹھکانوں پر لوٹ آئے۔ ابھی پہنچے ہی تھے کہ دشمن کی طرف سے شدید فائرنگ شروع ہوگئی۔ ہم نے اپنے کھودے حفاظتی گڈھے میں پناہ لے لی اور فائرنگ بند ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ لیکن فائرنگ بند ہونا تو دور بڑھتی ہی گئی اور کسی کا اپنی جگہ سے ہلنا دوبھر ہوگیا۔ توپ کے گولے، بارودی سرنگ، کٹیوشا میزائل، مارٹر شل! دھرتی کا نقشہ ہی بدل گیا تھا۔ ایسی گرد اٹھی کہ دو تین میٹر کی دوری پر کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے سوچا اگر عراقیوں کے ٹینک مورچہ کا محاصرہ کرلیں تو کسی کو پتہ بھی نہیں چلے گا۔

گولی کی رفتار سے ایک شخص راستہ کے بائیں طرف سے اوپر آیا لیکن پاس ہی ایک میزائل آکے گرا جس کی وجہ سے زمین پر اس تیزی سے لیٹا جیسے پانی میں کودا ہو۔ اس کے بعد اٹھا اور پھر دوڑنے لگا۔ برادر کریم کے سپاہیوں میں سے تھا شاید کوئی پیغام پہنچا رہا تھا یا پوچھنا چاہتا تھا کہ کیا، کیا جائے لیکن واپس جاتا دکھائی نہیں دیا۔

ایسے ہی پھنسے رہے۔ ہمارے ٹینک دشمن کی طرف فائر کرتے رہے لیکن دشمن کی شدید فائرنگ کے مقابلہ مین ان کا فائر محسوس تک نہیں ہو رہا تھا۔ صورتحال بہت خطرناک لگ رہی تھی۔ دھویں اور گرد سے میرا سینہ جل اٹھا تھا۔ میں نے سوچا جیسے بھی ہو مجھے حسین تک پہنچنا چاہیئے۔ اٹھا اور دوڑنا شروع کر دیا۔ ایک مارٹر شل ٹھیک مورچہ پر آ گرا جس سے میرے سر اور چہرہ پر بڑی مقدار میں خاک آ گری، دھویں کی بو نہ پوچھیئے! بہر حال کسی طرح حسین کے پاس پہنچا۔

'کیا کرنا ہے سید'؟

'ابھی نہیں معلوم'۔

'لگتا ہے جوابی کاروائی کرنا چاہتے ہیں'۔

'لگ یہی رہا ہے'۔

کچھ الگ سی غر غراہٹ سنائی دی اور اس کے بعد مورچہ پر یکے بعد دیگرے کئی گولے! ہم نے سر نیچے کر لئے۔ حسین بولے 'اسی کی کمی رہ گئی تھی' اور واپس جارہے ہیلی کاپٹر کو دیکھنے لگے۔

میں نے کہا 'اس فائرنگ میں ہمارا بہت نقصان ہو جائے گا، آگے بڑھنے کا حکم کیوں نہیں دیا جارہا ہے'؟

'عراقی ہر جگہ ایسی ہی فائرنگ کر رہے ہیں۔ صورتحال کچھ بگڑ گئی ہے، ایسے میں فیصلہ لینا مشکل ہے'۔

ایک میزائل سیدھا مورچے کے پیچھے آگرا جس کے ساتھ ہی ایک چیخ سنائی دی لیکن پتہ نہ چل سکا کہ کون زخمی یا شہید ہوا ہے، کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ایک طبی امداد والا زخمی کی طرف دوڑا۔ حسین کہنے لگے 'دیکھا ادھر اُدھر نہیں مار رہے ہیں۔ اس جگہ کا ٹھیک سے پتہ لگا رکھا ہے'۔

'ہمارے سامنے کون سی فوج ہے'؟

'ڈویژن ۱۰'

'تو کیا کریں'؟

'صبر کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے'۔

'تو میں اپنی جگہ واپس جارہاہوں'۔

میں اپنی جگہ واپس آگیا۔سب پیش قدمی کے حکم کا انتظار کر رہے تھے اور مستقل خبر آرہی تھی کہ آدھے گھنٹہ ایک گھنٹہ بعد پیش قدمی شروع کی جائے گی لیکن دوپہر ہونے کو تھی اور ابھی تک کچھ پتہ نہ تھا۔اس کے بعد عراقی جہاز ہمارے سروں پر سے گذرے اور دریائے کرخہ کی طرف مڑ گئے۔کچھ دیر بعد میں نے پشتہ کے اوپر سے دیکھا وہاں دور کافی گرد اُٹھ رہی ہے۔ ہماری فائرنگ تو اتنی شدید نہیں تھی لہٰذا الگ نہیں رہا تھا کہ یہ دھول ہماری گولہ باری سے اٹھی ہو۔دوبارہ دوڑا حسین کے پاس پہنچا۔

'آگے دیکھا'؟

'ہاں'۔

'کیا معاملہ ہے'؟

'ڈویژن ۱۰ کے ٹینک ہیں، آگے بڑھ رہے ہیں'۔

'ہمارے توپ خانہ سے ان پر فائر کیوں نہیں ہو رہا'؟

' توپ خانہ پر بمباری ہو گئی ہے'۔

'یعنی ہمارا محافظ جاتا رہا'؟

'ہمارا محافظ جانے والا نہیں ہے، ہمارا محافظ اللہ ہے'۔

جب حسین نے یہ کہا تو میرے دل کو عجیب سا اطمئنان ہو گیا جبکہ جو صورتحال تھی اس میں اطمئنان کی گنجائش نہیں تھی۔ ابھی میں ان سے الگ نہیں ہوا تھا کہ وائرلیس پر ساری یونٹوں کو پانچ سو میٹری عقب نشینی کا حکم دیا گیا۔

انہوں نے مجھے تعجب سے دیکھا اور پھر کمان سے رابطہ کر کے کہا 'یہ کیسا حکم ہے؟ اور وہ بھی ایسے وقت میں جب ہم پیش قدمی کے لئے تیار ہیں'؟

جواب ملا 'کوئی چارہ نہیں ہے۔ یہ جنگی حکمت عملی کا تقاضا ہے'۔

دن کے دو بج رہے تھے اور اب دشمن کی فائرنگ میں کچھ کمی آگئی تھی۔

حسین نے کہا 'کوئی چارہ نہیں ہے، ہمیں پانچ سو میٹر پیچھے جانا ہے، سب کو بتا دیجئے'۔

'لیکن سید اس طرح عقب نشینی سے یہ مورچہ بھی ہمارے ہاتھ سے جائے گا اور پیچھے کوئی پناہ گاہ بھی نہیں ہے'۔

'مجھے پتہ ہے لیکن حکم پر عمل ضروری ہے'۔

کسی طرح سے بائیں طرف کریم اور ان کے ساتھیوں تک بھی خبر پہنچائی اور ہم پانچ سو میٹر پیچھے آگئے۔ نئی جگہ پر صرف جھاڑیوں کے پیچھے ہی پناہ لی جا سکتی تھی۔ جھاڑیوں کی اونچائی ساٹھ سے ستر سینٹی میٹر تک تھی۔ جو ساتھی دشمن کی فائرنگ کی وجہ سے نماز نہیں پڑھ سکے تھے انہوں نے وہاں نماز ادا کی یہ اور بات ہے کہ کوئی بھی کھڑے ہو کر نماز نہ پڑھ سکا۔

تھوڑی دیر بعد میں نے محمد حسن کو دیکھا حسین کی طرف دوڑے چلے جا رہے تھے۔ میں نے پوچھا 'کہاں'؟

جواب دیا' دشمن کے ٹینک ہماری عقب نشینی سے فائدہ اٹھا کر تیزی سے آگے بڑھ رہے ہیں' اور مجھے اپنی فولڈنگ جی۔۳ دکھا کر بولے 'اس کا اب کوئی فائدہ نہیں ہے، آر، پی، جی کا انتظام کرنے جارہا ہوں'۔

وہ چلے گئے۔ ٹینک کا ایک گولہ سیدھا ہم لوگوں کے نزدیک آگرا۔ میں نے اپنا چھوٹا سا نیزہ نکالا اور زمین کھودنا شروع کر دی۔ کبھی بارودی سرنگ نصب کرنے کے گڈھا کھودتے تھے اور آج اپنے بچاؤ کے لئے گڈھا کھودنا پڑ رہا تھا۔

گرد و غبار کے بیچ وقتاً فوقتاً اپنے ٹینک بھی دکھائی دیتے جو دور ہوتے جا رہے تھے۔ ایک کلومیٹر پیچھے جا چکے تھے اور ابھی بھی رکے نہیں تھے۔ بعد میں پتہ چلا کہ شاید انھوں نے پانچ سو میٹر کے بجائے پانچ کلومیٹر سنا ہے۔ میں دوڑا حسین کے پاس پہنچا۔

'کیا ہوا سید'؟

'ٹینک کیوں ہمیں چھوڑ کر چلے گئے ہیں'؟

'نہیں معلوم کوئی ٹھیک سے جواب نہیں دے رہا ہے'۔

'اب کرنا کیا ہے'؟

'ہر صورت میں انہیں روکنا ہے'۔

تھوڑی دیر میں غفار بھی دوڑے دوڑے ہانپتے کانپتے پہنچے۔ سر اور چہرہ خاک آلود تھا۔

'ہمیں اکیلا چھوڑ دیا ہے۔ عراقی تیزی سے آگے آ رہے ہیں'۔

حسین بولے 'کہئے آر، پی، جی والے جتنے ہیں سب یہاں اکٹھا ہوں'۔

اٹھے اور عراقیوں کی طرف دیکھ کر بولے 'بری طرح سے آگے بڑھے چلے آ رہے ہیں۔ لگتا ہے مطمئن ہو گئے ہیں کہ اب انہیں روکنے والا کوئی نہیں ہے'۔

دونوں طرف سے ہمارے ساتھیوں کی فائرنگ کی آوازیں آنے لگیں۔ حسین بولے 'کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اس کا علاج صرف آر، پی، جی ہے۔ یہ ٹینک ہمیں روکنا ہوں گے۔ اگر یہ مفلوج ہو گئے تو ہماری افواج پھر حملہ کی اہل ہو جائیں گی۔ انہیں بھی منظم ہونے کا موقع ملنا چاہئے'۔

قدوسی، حکیم اور دیگر آر، پی، جی والے حسین کے پاس پہنچے۔ حسین کچھ کہنا ہی چاہتے تھے کہ اچانک ہماری پناہ گاہ کی پشت گولیوں کی بوچھار سے چھلنی ہو گئی۔ کوئی چلایا 'ان کی پیادہ فوج بھی آگے بڑھی آرہی ہے' اور جواباً عراقیوں کی طرف کئی گولیاں چلا دیں۔ میں نے بھی اٹھ کے دیکھا وہاں دور ٹینکوں کی اوٹ میں پیادہ فوجی بھی آرہے ہیں اور ان کی طرف آدھا میگزین خالی کر دیا لیکن انہوں نے ٹینک کے پیچھے پناہ لے لی۔

حسین نے کہا 'تمام میزائل یہاں جمع کئے جائیں'۔

میزائل آ گئے، آر، پی، جی والے موجود تھے۔ حسین نے ہدایت دی 'ان ٹینکوں کو روکنا ہو گا نہیں تو اگر یہ آگے آگئے تو ہمارے سپاہیوں کا قتل عام کر دیں گے'۔

قدوسی بولے 'ہم لوگ تیار ہیں'۔ حکیم آخری میزائلوں میں گولے لگا رہے تھے۔

حسین نے سمجھایا' جیسا کہ آپ لوگ دیکھ رہے ہیں ٹینک بہت زیادہ ہیں اور ہمارے پاس امیونیشن کم ہے۔ لہٰذا کچھ بھی ضائع مت ہونے دیجئے۔ صرف اسی وقت فائر کیجئے جب آپ کو یقین ہو کہ آپ کا گولہ ٹینک ہی کو لگے گا۔ یہاں سے سو میٹر آگے لومڑی کے طرز کے گڈھے موجود ہیں جو کل آپ ہی لوگوں نے کھودے تھے۔ ہم ان میں پناہ لیں گے اور ٹینک پوری طرح پاس آنے کا انتظار کریں گے'۔

میزائل آپس میں تقسیم کئے اور بیگ بھر لئے۔ حکیم ٹیلے کے اوپر سے دیکھ رہے تھے کہنے لگے' ہمارے سامنے کم از کم تیس ٹینک ہیں'۔

حسین کے الفاظ تھے' ہمیں ان سے کوئی خوف نہیں ہے۔ آخری گولی تک فائر کریں گے۔ نتیجہ جو بھی ہو! نتیجہ اہم نہیں ہے، اہم فرض کی ادائیگی ہے۔ بسم اللہ'۔

یہ کہہ کے میزائل آر، پی، جی لانچر میں جوڑا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ دیگر افراد بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ ٹینک کا فائر ٹیلہ کے اس طرف لگا جس سے کافی دھول

اٹھنے لگی۔ گولیاں ایسے چل رہی تھیں جیسے کبھی رکیں گے ہی نہیں اور ہمارے اوپر سے گذر رہی تھیں۔

میرا میگزین خالی ہو گیا تھا دوسرا لگایا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ حاجی طعمہ بھی آ گئے تھے۔ ہم جیسے ہی چلنے کے لئے یتار ہوئے۔ حسین نے پوچھا 'کہاں'؟

'ٹینکوں کی خبر نہیں لینا ہے'؟

'آپ لوگ نہیں۔ جن سات افراد کے پاس آر، پی، جی ہے بس وہی'۔

تعجب ہوا۔ میں نے کہا 'کیا کہہ رہے ہیں حسین'؟

'وہی جو آپ لوگوں نے سنا۔ چوں چرا کی گنجائش نہیں ہے۔ وہاں آپ لوگوں سے کچھ نہیں ہو پائے گا۔ یہیں سے دفاع کیجئے اور اگر ہو سکے تو ساتھیوں کو پیچھے لے جایئے گا'۔

میرا گلا رندھ گیا تھا۔ مشکل سے کہہ پایا 'حسین آپ جانتے ہیں ہمیں کس مشکل کام کا کہہ رہے ہیں؟ یہ میرے بس میں نہیں ہے'۔

،حکم پر عمل کیجئے۔ نہ صرف خود آگے مت آیئے بلکہ دوسروں کو بھی مت آنے دیجئے یہ آپ اور حاجی طعمہ دونوں کی ذمہ داری ہے'۔

'میرے بس میں نہیں ہے حسین'۔

'آپ کے بس میں ہے۔ یہ میری آپ سے آخری خواہش ہے'۔

مشکل سے خود کو روک پایا۔ حسین اور ان کے ساتھی شہادت کا استقبال کر رہے تھے۔ اس کے بعد میں نے کہا 'میری تمنا تھی کہ آپ کے سامنے مروں اور اب آپ مجھ سے یہ چاہ رہے ہیں کہ۔۔۔'۔

ایک شل ہمارے پاس آکر گرا۔ ساعت جاتی رہی۔ سب گرد و غبار میں کھو گئے، بڑی مشکل سے کچھ دکھائی یا سنائی دے رہا تھا۔ فقط حسین کی دلنشیں آواز آرہی تھی 'یا علیؑ'!

حسین، غفار درویشی، محمد علی حکیم، محمد حسن قدوسی اور تین دیگر افراد ٹیلہ سے اوپر چڑھے اور صحرا میں بکھر گئے۔ آخری بار انہوں نے ہمیں ایسے دیکھا کہ جیسے اب ہمیں نہ دیکھ پائیں گے یا دنیا سے رخصت ہو رہے ہیں۔

میں اور میرے ساتھی کیا کرتے۔بس ہلکے ہتھیاروں سے تھوڑی سی انہیں سپورٹ دے سکتے تھے۔ اب ٹینک اور شدت سے ہم پر فائر کررہے تھے۔کچھ سپاہیوں نے سوچا کہ پیش قدمی شروع ہوگئی ہے وہ ان کے پیچھے دوڑے۔ میں نے چلا کر کہا 'کوئی آگے نہ جائے، یہیں سے دفاع کیجئے، یہیں رکیئے'۔

ایک خشمگیں آواز آئی 'دیکھ نہیں رہے ہیں؟ حسین اور ان کے ساتھی آگے گئے ہیں'۔

میں نے کہا 'یہیں رکئے، یہ حسین کی خواہش ہے'۔

سپاہیوں کو روکنا بہت مشکل تھا لیکن کسی طرح کسی کو آگے نہیں جانے دیا۔ ارد گرد کی جھاڑیاں جل رہی تھیں۔ کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں فائر بھی کر رہا تھا اور ٹیلہ کے اوپر سے حسین اور ان کے ساتھیوں کو گڈھوں کی طرف دوڑتا دیکھ بھی رہا تھا۔ سب نے گڈھوں میں پناہ لے لی اور اس کے بعد حسین ہی نے سب سے پہلے دو سو میٹر کی دوری پر پہنچ چکے ٹینک کا آر، پی، جی سے

نشانہ لیا۔ میزائل ٹینک کے درمیان میں لگا جس کے نتیجہ میں اس میں آگ لگ گئی۔ دوسرے ساتھیوں نے بھی میزائل فائر کئے اور چند منٹ کے اندر چار پانچ ٹینک اڑ گئے اور دشمن کی پیش قدمی کا سلسلہ کچھ دیر کے لئے رک گیا۔ لیکن انہیں بہت جلد پتہ چل گیا کہ ان پر کہاں سے فائر ہو رہا ہے اور اب ٹینک کی نال کا رخ انہیں گڈھوں کی طرف موڑ لیا۔ ٹینک کے پہلے فائر سے غفار کا مورچہ دھویں اور غبار میں ڈوب گیا۔ میں انتظار کرتا رہا کہ گرد و غبار چھٹے اور مجھے غفار دکھائی دیں لیکن اب وہ نظر نہیں آئے۔ باقی افراد نے پھر فائر کئے اور کئی ٹینک اڑا دیے۔ اب باقی ٹینک اور بھی نزدیک آ گئے تھے اور انہیں گڈھوں کی طرف آگے بڑھ رہے تھے۔ پہلا ٹینک اس گڈھے کی طرف بڑھا جس میں غفار نے پناہ لی تھی اور اس کے اوپر سے گذر گیا۔ ہماری گولیاں ٹینک سے ٹکرا کے واپس ہو جاتیں لہٰذا ہم صرف یہ کر سکتے تھے کہ دشمن کے پیادہ سپاہیوں کو پیچھے ڈھکیل دیں۔ اب میدان جنگ میں ٹینک اور حسین اور ان کے ساتھی تھے اور ہم دھویں اور غبار کے بیچ انہیں دوڑتا یا فائر کرتا دیکھ لیتے۔

میرے ساتھی سپاہیوں کو مستقل جگہ بدلنی پڑ رہی تھی ٹینکوں کے نیچے سے ایسی گردو غبار اڑ رہی تھی جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا اور ایک نے تو آر، پی، جی کے نشانہ سے بچنے کے لئے دھواں چھوڑنے والا بٹن بھی آن کر رکھا تھا۔

میں آگے ہی دیکھ رہا تھا۔ ایک مرتبہ حسین کو دیکھا اپنی پناہ گاہ سے نکلے اور سامنے سے آرہے ایک ٹینک کی طرف دوڑے۔ ٹینک پر سوار دشمن کو ان کا پتہ چل گیا لیکن وہ جب تک آپ کا نشانہ لیتا آپ کھڑے ہوئے اور آر، پی، جی کندھے پر رکھ کر میزائل فائر کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ ٹینک میں آگ لگ گئی لیکن دوسرے ٹینک کو پتہ چل گیا اس نے فوراً نال آپ کی طرف موڑی اور فائر کر دیا۔ گولہ آپ کے نزدیک زمین پر گرا میں نے دیکھا کہ آپ ایک لمحہ کے لئے ہوا میں اچھلے اور اڑے، گردن کے گرد بندھے رومال میں ایسی حرکت ہوئی جیسے کوئی پرندہ پر مارتا ہے۔ اگلے لمحہ آپ پشت کے بل زمین پر گرے اور چہرہ کو رومال نے ڈھانپ لیا۔ مجھ میں جتنی سکت تھی اتنی بلند آواز سے کہا 'یا حسین! حسین! حسین'!

لیکن حسین نہ اٹھے۔ میں نے ٹینک کی طرف اندھا دھند فائر کیا۔ سیدھے حسین کی طرف جا رہے ٹینک نے راستہ بدلا اور ایک گولہ ہماری طرف فائر کیا۔ مجھے مجبوراً سر نیچے کرنا پڑا۔

کسی ساتھی کی لرزتی آواز آئی 'ساتھیو! حسین کو مار دیا ہے! حسین کو مار دیا ہے'!

ایک شور سا اٹھا اور مجھے لگا کہ وقت رک گیا ہے۔ اب نہ کوئی آواز آ رہی تھی اور نہ ہی کوئی دکھائی دے رہا تھا۔ میرے سامنے صرف حسین کی تصویر تھی جو وہاں پڑے ہوئے تھے اور ابھی زندہ تھے۔ اٹھنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن۔۔۔ اس کے بعد مجھے اپنے پیچھے اندھا دھند فائر کی آواز آئی اور ایک ساتھی کی آواز سے میں ہوش میں آیا 'گاڑیاں! گاڑیاں' لیکن اس کی آواز ادھوری رہ گئی اس لئے کہ ٹیلہ کے پیچھے سے آئی ایک گولی نے اسے خون میں غلطاں کر دیا۔ پلٹ کر دیکھا چار گاڑیاں دائیں طرف سے نزدیک آتی جا رہی ہیں اور ہر ایک پر گن لگی ہے جس سے ایک ایک کر کے ہمارے ساتھی قتل ہو رہے ہیں۔ کلاشنکوف اور جی۔۳ سے انہیں روکنا ممکن نہیں تھا۔ میں نے سوچا

ایک گاڑی جو سب سے نزدیک تھی اس پر بیٹھے فائر کر رہے دشمن کو اڑادوں لیکن ناکام رہا۔اس کے بعد ایک آواز آئی 'ٹینک! ہمارے ٹینک آگئے ہیں'۔

پلٹ کے دیکھا تو ساتھ آٹھ ٹینک ہمیں اپنے پیچھے سے آتے دکھائی دیے انہیں دیکھ کر ساتھیوں کے حوصلے بلند ہو گئے۔

'مزاحمت کرتے رہئے۔ ہمارے لئے امداد پہنچ رہی ہے'۔

ٹینکوں نے فائر شروع کیا لیکن عراقیوں کے بجائے ہم پر۔ ایک ساتھی چلایا' یہ ایسے کیوں کر رہے ہیں'؟

فوراً ہی پتہ چل گیا کہ وہ بھی عراقیوں ہی کے ہیں۔جب ہماری توجہ آگے کی طرف تھی تو انہوں نے ہمارا محاصرہ کر لیا تھا اور اب ہم تقریباً مکمل طور پر نرغۂ اعداء میں تھے۔ سامنے اور پیچھے سے ٹینک آرہے تھے اور دائیں طرف سے فوجی گاڑیاں۔ لگ رہا تھا کہ اب ہمارا کام تمام ہی ہے لیکن ساتھیوں نے مزاحمت ترک نہ کی اور فائرنگ جاری رکھی جس کے نتیجہ میں راستہ کے بائیں طرف مورچہ زن برادر کریم اور ان کے ساتھی عقب نشینی کرنے میں

کامیاب ہو گئے۔ جب ٹینک اور نزدیک آ گئے تو ہم نے ان پر گرینیڈ پھینکنے شروع کئے لیکن ان سے کیا ہونے والا تھا۔ بھیانک قتل عام شروع ہو گیا۔ ہم پر ہر طرف سے فائر ہو رہا تھا۔ سامنے سے آنے والے ٹینک گڑھوں کے اوپر سے گذر کر شہداء کی لاشیں کچل رہے تھے۔

میرے پاس صرف ایک میگزین بچا تھا اور اب مزاحمت بھی کیا ہوتی۔ اکثر ساتھیوں کا امیونیشن ختم ہو گیا تھا۔ میں نے بندوق کے آگے ایک ساتھ تین فائر کرنے والا پرزہ لگایا لیکن اس سے بھی کچھ نہیں ہوا اور میگزین بہت جلد خالی ہو گیا۔ اب ٹینک بالکل ہمارے سامنے تھے اور ایسی گردوغبار اٹھی تھی کہ کوئی بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا اور نہ یہ پتہ چل رہا تھا کہ کون زندہ ہے اور کون شہید ہو گیا ہے۔

میں سینہ کے بل چل کے ایک شہید کے پاس پہنچا کہ اس کا اسلحہ اٹھا کر استعمال کروں لیکن عین اسی وقت ایک گولی میری ران کو چیرتی ہوئی نکل گئی۔ لڑھک کر جھاڑی کے پاس پہنچ گیا، چھپنا چاہتا تھا لیکن یہ ممکن نہ ہوا۔ ایک عراقی مجھ پر

بندوق تانے میرے سر پر کھڑا تھا اور میں اسے دھماکوں سے پیدا شدہ گرد وغبار کے باعث نہ دیکھ پایا تھا۔ اب میں کچھ بھی کرنے سے قاصر تھا۔ عراقی آفیسر کے چہرہ پر نگاہیں جمائے اس کے فائر کا انتظار کرنے لگا لیکن اس نے فائر نہیں کیا اور دو کانسٹبلوں کو بلایا جنہوں نے میرے ہاتھ پیر باندھ کر مجھے وہیں چھوڑ دیا۔ چیخ وپکار کی آواز بتا رہی تھی کہ عراقی باقی ساتھیوں کو قید کر رہے ہیں۔ اب فائرنگ کی آواز کم ہو گئی تھی۔

زمین پر پڑے پڑے میں نے ران کا زخم زمین کے ساتھ لگا کر دبا لیا تا کہ خون نہ بہے۔ تھوڑی دیر بعد وہی دو سپاہی آپہنچے اور مجھے ہاتھوں اور پیروں سے پکڑ کر ایک ٹینک کے سامنے باندھ دیا۔ ٹینک ٹیلوں سے گذرتے ہوئے وہاں پہنچے جہاں حسین اور ان کے ساتھی تھے۔ میرے علاوہ اور بھی کئی افراد قیدی بنا لئے گئے تھے جن کی تعداد سینتیس تھی، یہ مجھے بعد میں پتہ چلا تھا۔ کچھ کو ٹینک سے بھی باندھ رکھا تھا۔۔۔

محترمی ومکرمی!

یہ خط حد سے زیادہ طولانی ہو گیا ہے لیکن مجھے لگتا ہے کہ میں حسین کے بارے میں کچھ بھی نہیں بتا پایا۔ میں نے جو دیکھا ہے اگر وہ سب بیان کر دوں تب بھی جہادی حسین کی مکمل غمازی نہیں ہو گی اور عالم یہ ہے کہ میں نے جو ان کی جہادی شخصیت دیکھی تھی اسے بھی پوری طرح بیان نہیں کر پایا ہوں۔ ٹوٹی پھوٹی داستان ہے جسے کسی بھی طور حسین کے لائق نہیں قرار دیا جا سکتا۔ لیکن اب جب بات یہاں تک پہنچ ہی گئی ہے تو مجھے ایک دردناک اعتراف کر لینے دیجئے اور مجھے خوشی ہے کہ میں یہ اعتراف ایسے وقت میں کر رہا ہوں جب حسین کی ماں جو خود ایک شیر دل خاتون تھیں اس دنیا میں نہیں ہیں۔

آپ جانتے ہیں کہ میں برسوں قید میں رہا ہوں اور یقیناً آپ نے قیدیوں کے ساتھ عراقیوں کے وحشیانہ سلوک کا بھی سن رکھا ہو گا لیکن مجھے صرف ایک لمحہ کے لئے ایذا رسانی کی گئی۔ لیکن اس ایک لمحہ کی ایذا رسانی کے درد سے آج تک ایک بار بھی آرام سے سو نہیں پایا ہوں۔ **ہاں! مجھے اس ٹینک سے باندھا گیا تھا جو حسین کے جسم اطہر کے اوپر سے گذرا اس حال میں کہ وہ ابھی زندہ تھے۔** چہرہ رومال سے چھپا تھا لہٰذا اپنی خوبصورت اور دلنواز آنکھوں سے

میری تکلیف نہیں دیکھ پا رہے تھے۔میں نے حسین کی ہڈیاں پسنے کی آواز سنی۔سچ پوچھئے تو میں نے اس وقت خدا کا شکر ادا کیا کہ مجھے قیدی بنالیا گیا ہے وگرنہ جب آخری مرحلہ پر مجھے حسین کا ساتھ نصیب نہیں ہوا تو میں کس منہ سے واپس جاتا اور کس زبان سے کہتا کہ 'حسین گر گئے اور ہم کھڑے رہے۔

تیسری کہانی

رات کا وقت تھا میں کھڑکی کے پاس بیٹھا سوچ رہا تھا کہ اگر صورتحال یہی رہی تو کیا، کیا جائے گا۔ سردی بھی تھی اور اندھیرا بھی۔ نہ چاند ہی نمودار ہوا تھا اور نہ ستارے ہی روشنی بکھیر رہے تھے۔ وقفہ وقفہ سے گاؤں کے آس پاس مارٹر گولے آکر گرتے اور دہشت زدہ کتے بھونکنے لگتے۔ اتنا کہ بھونکتے بھونکتے تھک جاتے اور ایک ایک کرکے چپ ہونے لگتے لیکن آخری کتے کے چپ ہونے سے پہلے ہی ایک اور گولہ آگرتا۔۔۔ صورتحال یہ ہو گئی تھی کہ گاؤں میں ہمیشہ کتے مستقل بھونکتے ہی رہتے اور اگر کہیں گھر کے نزدیک ہوتے تو کوئی اور آواز سننا ممکن نہ ہوتا۔

انسان کو کئی چیزوں کی عادت ہو جاتی ہے اور مجھے بھی آہستہ آہستہ ان آوازوں کی عادت سی ہو گئی تھی اور اب عالم یہ تھا کہ میں یہ بھی نہیں پوچھتا تھا کہ گولہ کہاں گرا اور کسی گھر کو تو نقصان نہیں پہنچا؟ البتہ ایسا نہیں تھا کہ اس کا مجھ پر کوئی فرق ہی نہیں پڑتا تھا اور میں لاتعلق سا ہو گیا تھا بلکہ نہیں چونکہ ایک سیلاب آرہا تھا اور اسے روکنا ممکن نہیں لگ رہا تھا لہٰذا ہاتھ پیر مارنے کا کیا فائدہ تھا؟ مجھے پتہ تھا کہ آخر کار ہمارے گاؤں پر قبضہ ہو جائے گا اور ہمارا حال

بھی وہی ہو گا جو دوسرے گاؤں والوں کا ہے۔ تقدیر میں ہی شاید یہی لکھ گیا تھا البتہ اس کے تصور سے ہی رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے یعنی ہمیں بھی گاؤں سے باہر آمد و رفت کے لئے عراقیوں سے اجازت لینا پڑتی ہر دن انہیں بتانا پڑتا۔ اس کی مثال یہ تھی کوئی اجنبی گھر کی کھڑکی سے آپ اور آپ کے اہل خانہ پر نظر رکھے کہ آپ لوگ کیا کر رہے ہیں اگر کوئی اور مسئلہ نہ بھی ہو تب بھی کیا یہ قابل برداشت ہے؟

میرے ساتھ عراقیوں نے کبھی برا نہیں کیا تھا، میری روزی روٹی کا انتظام انہیں کے ذریعہ ہوتا تھا لیکن اگر ان کا اس طرف قبضہ ہو جاتا تب مجھ پر رحم نہ کھاتے۔ میں چالاکی سے کبھی پھنسا نہیں تھا۔ لیکن اب معاملہ کچھ اور تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ کیا بڑے دشمن کے لئے چھوٹے دشمن سے ہاتھ ملایا جا سکتا ہے؟ کبھی کبھی انقلاب محافظ فوج کے جوان اور انقلاب کمیٹی کے افراد شام کے وقت ہمارے گاؤں کے پاس سے گذرتے اور جھاڑیوں کی طرف چلے جاتے۔ جب صبح میں واپس آتے تو تھکے ماندے، پریشاں حال، مٹی سے اٹے کپڑوں میں شہر کی راہ لیتے۔ ان کی آنکھیں رات میں جاگنے کی وجہ سے سوجھ

چکی ہوتیں اور بعض دفعہ محسوس ہوتا کی بھاری بیگ اٹھانے کی وجہ سے مشکل سے کھڑے رہے ہیں۔ ان کا حال دیکھ کر کوفت ہوتی تھی اور میں زبردستی خود کو انہیں گھر بلانے سے روکتا۔ اپنے آپ سے کہتا کہ یہ یاد رکھنا کہ اگر انہیں کو موقع ملا تو تمہیں اٹھا کے جیل میں ڈال دیں گے تب انہیں تم پر رحم نہیں آئے گا۔ فی الحال اپنی فکر کرو۔ تمہیں اس سے کیا کہ یہ لوگ کون ہیں اور کہاں جا رہے ہیں تم بس اپنے کام سے کام رکھو۔ اس جنگ کا تم سے کوئی ربط نہیں ہے۔ ملک میں فوج ہے حکومت نے انہیں اسی دن کے لئے برسوں پالا ہے۔ اب آ کر لڑیں۔ اب اگر کسی کو اپنی جان کی پرواہ نہیں ہے تو میں کیا کروں۔ میرا فرض ہر حال میں گھر کی روزی روٹی کا انتظام ہے اور میری جنگ بھی یہی ہے، بھوک کے خلاف!

یہی سب سوچ رہا تھا کہ اتنے میں دق الباب ہوا۔ اتنی رات گئے کون ہو سکتا تھا؟ دروازہ کھولا تو دیکھا حسن ہیں میرے ہم پیشہ۔ اندھیرے میں ان کے دانت چمک رہے تھے۔

'کہاں ہو حسن'؟

'کہاں ہونا چاہئے تھا'؟

'تمہارا دوست پریشان ہے اور سب کو برا بھلا کہہ رہا ہے'۔

'تم نے کہاں دیکھا اسے'؟

'جہاں طے تھا'۔

'گئے تھے'؟

'ہاں'۔

'سامان لے آئے'؟

'ہاں'۔

'لیکن میرا تو اس کے ساتھ کچھ طے نہیں ہوا تھا، اسے کل آنا چاہئے تھا'۔

'بہر حال وہ آیا ہوا ہے اور بہت پریشان ہے، کہہ رہا تھا تمہارا انتظار کر رہا ہے'۔

'راستوں کی صورتحال کیا ہے'؟

'راستے ٹھیک ہیں میں بغیر کسی پریشانی کے یہاں پہنچا ہوں'۔

'تو اب صبح میں مجھے وہاں جانا ہے'؟

'ہاں بھائی! مذاق تھوڑی کر رہا ہوں، وہ کافی سامان تمہارے لئے لایا ہے'۔

'تم لے کے آجاتے'۔

'مجھے نہیں دیا'۔

'تم کیسے گئے تھے'؟

'دو گدھے لے کر گیا تھا'۔

کوئی چارہ نہیں تھا، مجھے بہر صورت جانا ہی تھا۔ اصطبل گیا، گدھے پر جھول باندھی، چمڑے کا تھیلا چڑھایا اور کلاشنکوف جو میں نے چھپا کر رکھی تھی اٹھا کر جھول اور تھیلے کے درمیان میں رکھ لی اور چل دیا۔ اپنے آپ سے کہا آج رات ویسے بھی نیند نہیں آرہی تھی اچھا ہی ہوا یہ کام ہو جائے گا۔

گاؤں سے نکلا، گدھے پر سوار ہو کر اسے ہانکا اور سوسنگرد جانے والے راستہ پر چلنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد مجھے دور سے ایک گاڑی آتی نظر آئی میرے پیچھے سے آ رہی تھی اور سوسنگرد جانا چاہتی تھی اور صرف چھوٹی لائٹیں جلا رکھی تھیں۔ فوراً گدھے سے اترا اور اسے کھینچ کر درختوں کے پیچھے لے گیا جب گاڑی نزدیک پہنچی تو دیکھا کہ ٹویوٹا ہے لیکن یہ پتہ نہیں چل پایا کہ ایرانی ہے یا عراقی۔ یہ لوگ کہاں جا رہے تھے؟ پتہ نہیں۔ اتنے میں گاڑی رک گئی اور اس کے پیچھے سے کئی افراد چھلانگیں لگاتے ہوئے نیچے اترے۔ پہلے میں نے سوچا کہ خراب ہو گئی ہے اور یہ لوگ اسے دھکا دینے کے لئے اترے ہیں لیکن جب دیکھا کہ دائیں بائیں پھیل گئے ہیں تو میں ڈر گیا۔ یہ لوگ مجھے تو نہیں ڈھونڈھ رہے ہیں؟ ایسا تو نہیں میرے دوست نے مجھے دھوکہ دے کر پھنسا دیا ہے۔

لیکن وہ ایسا کیوں کرے گا؟ شاید اسے گرفتار کر لیا ہو اور اس پر دباؤ ڈالا ہو کہ وہ مجھے بھی پکڑوائے۔ ہم لوگ جو پیشہ اختیار کئے ہوئے تھے اس میں کسی پر بھی زیادہ بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ مجھے سب کچھ سوچنا چاہئے تھا۔ آہستہ سے

گدھے کی طرف گیا، کلاشنکوف نکالی اور اس میں آہستہ سے راؤنڈ بھر لئے۔ دور ایک توپ کی آواز آئی۔ وہ جو میری طرف آرہے تھے رک گئے، شاید فائر کی آواز نے انہیں روک دیا تھا۔ بہر حال میں بھی فائر کے لئے تیار ہو گیا، وہ لوگ کئی تھے اور میں اکیلا اگر میں پہل نہ کرتا تو وہ مجھے دھر دبوچتے۔ کچھ پریشان ضرور تھا لیکن ڈر نہیں رہا تھا۔ خود کو ہر چیز کے لئے تیار کر لیا تھا۔ میں نے روز اول ہی یہ اپنے کو سمجھا دیا تھا کہ میں خطرناک راستہ پر چل رہا ہوں، کسی دن ٹیڑھے راستوں میں کچھ بھی ہو سکتا ہے اس کے لئے مجھے ہر وقت تیار رہنا چاہئے۔

اب وہ لوگ جو میری طرف آرہے تھے اتنا نزدیک آچکے تھے کہ مجھے ان کی باتیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔

'لگتا ہے ہم کھو گئے ہیں۔۔۔اِدھر سے ہم کہیں نہیں پہنچ پائیں گے'۔

'بہتر ہے واپس چلے چلتے ہیں۔۔۔'۔

'تو وہ نقشہ جو دیکھا تھا۔۔۔'۔

'کہیں سیدھے ان کی کمیں گاہ میں نہ جا پہنچیں'۔

فارسی بول رہے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ ایرانی ہیں اور ابھی انہیں وہاں میری موجودگی کا پتہ نہیں چلا ہے۔ اگر پتہ چل گیا ہوتا تو ایسے آگے نہ آتے۔ انہیں کوئی اور کام تھا لیکن کیا؟ یہ نہ سمجھ سکا۔ اس کا مجھ سے کوئی مطلب بھی نہیں تھا کہ انہیں کیا کام تھا، میرے لئے بس اتنا ہی کافی تھا کہ وہ میری تلاش میں نہیں تھے۔

میں رکا رہا یہاں تک کہ وہ لوگ چلے گئے۔ اس کے بعد بندوق کندھے پر رکھی اور ٹیڑھے راستہ پر چلنے لگا اور تالابوں کی طرف جا نکلا۔ دو بڑے تالابوں کے درمیان ایک چھوٹا سا راستہ تھا جہاں سے صرف میں اور میرے چند دوست ہی عبور کر سکتے تھے۔ اجنبی یا تو دلدل میں پھنس جاتے تھے یا بہت جلد واپس ہو لیتے تھے۔ تقریباً آدھی رات کے وقت میں اس تنگ راستہ سے گذرا۔ جانتا تھا کہ میرا دوست دوسری طرف میرا انتظار کر رہا ہے لیکن جب وہاں پہنچا تو وہ

نظر نہ آیا۔ میں نے زور سے پکارا 'اے۔۔۔ کہاں ہو'؟ اور وہ ایک جھاڑی سے برآمد ہوا۔ پوچھنے لگا 'اکیلے ہو'؟

'کسی کے ساتھ آنا تھا کیا'؟

اس نے بندوق کی نال نیچے کی اور میرے قریب آگیا۔

'دیر کیوں لگادی'؟

'دیر لگادی؟ مجھے آنا کہاں تھا'؟

'یعنی تم آنا نہیں چاہتے تھے'؟

'نہیں، اگر تمہارا پیغام نہ ملتا تو میں ہرگز نہ آتا اس لئے کہ میرا کل آنا طے پایا تھا'۔

'ایسا تو نہیں تھا، تم نے سنا غلط'۔

کچھ دیر ہماری بحث چلتی رہی۔ اس کے جسم اور کپڑوں پر کیچڑ ہی کیچڑ تھا، میں نے پوچھا 'یہ کیا اپنی حالت بنا رکھی ہے'؟

'کہرے میں کھو گیا اور دلدل میں جا پہنچا، میرا کام تمام ہی ہونے والا تھا'۔

'کہرا تھا کیا'؟

'ہاں غروب کے وقت تھا'۔

پھر کسی نا معلوم مقام سے توپ کے فائر یا مارٹر شل کی آواز آئی۔ ہم دونوں چپ ہو کر سننے لگے۔ وہ کہنے لگا 'راستے غیر محفوظ ہو گئے ہیں۔ دونوں کی طرف کی گشتی پارٹیاں مستقل آمد و رفت کر رہی ہیں۔ کہیں انکے ہتھے نہ چڑھ جاؤں، آج کل آسانی سے کسی کو بھی مار دیتے ہیں اور کسی کی سانس لینے کی بھی آواز نہیں آتی'۔

'مجھے بھی چند ایک مل چکے ہیں'۔

'عراقی دوبارہ سوسنگرد کا محاصرہ کرنا چاہتے ہیں اگر سونگرد پر قبضہ ہو گیا تو ہویزہ بھی آسانی سے ہاتھ سے نکل جائے گا'۔

'لگ تو ایسا رہا ہے کہ یہ جنگ بہت لمبی چلے گی، لوگوں کی خدا ہی مدد کرے'۔

'ان حالات میں آدمی کو اپنی بندوق دونوں ہاتھوں سے تھام کر رکنی چاہئے تاکہ کہیں ہوا نہ اڑالے جائے۔ مجھے گرفتاری سے بہت ڈر لگتا ہے۔ علاقہ میں عراقیوں کے جاسوس پھیلے ہوئے ہیں اگر کہیں میں پکڑا گیا تو مجھے بھی جاسوس ہی سمجھ لیں گے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے ایک لومڑی بھاگ رہی تھی تو اس سے کسی نے پوچھا کہ کیوں بھاگ رہی ہو تو اس نے جواب دیا کہ اونٹ پکڑے جا رہے ہیں۔۔۔'۔

'مجھے اگر کوئی جاسوس مل جائے اور یقین آجائے کہ وہ دشمن کے لئے کام کر رہا ہے تو میں تو اسے نہیں چھوڑوں گا۔ ایسی خیانت تو بخشنے کے لائق نہیں ہے'۔

'ہٹاؤ چلو اپنا کام کرتے ہیں'۔

اس نے خچریں جھاڑی کے پیچھے باندھ رکھی تھیں، ایک بغیر کسی سامان کے تھی۔

سامان اتارا۔ ریڈیو، ٹیپ ریکارڈر، سگریٹ اور عطر وغیرہ تھا۔

میں نے کہا' اپنی ٹارچ دینا ذرا'۔

'تمہارے پاس نہیں ہے کیا'؟

'نہیں'۔

'یعنی تمہیں ضرورت نہیں پڑتی'۔

'سامان دیکھنے کے لئے'؟

'نہیں راستہ دیکھنے لئے، سامنے دیکھنے کے لئے'۔

'مجھے ان چیزوں کی ضرورت نہیں ہے۔ میں آنکھ بند کر کے بھی کہیں بھی آ جا سکتا ہوں۔ وہ تم ہو جو ہلکے سے کہرے میں راستہ بھول جاتے ہو'۔

میں اسے بیوقوف بنانا چاہتا تھا۔ کہنے لگا'کئی گھنٹے سے مجھے یہاں روکے ہوئے ہو اور اب طعنے بھی دے رہے ہو'؟

سامان میں نے پورا چیک کیا اور اپنے تھیلے میں بھر لیا۔ انگریزی صابن کے پیکٹوں پر گندی تصویریں تھیں وہ میں نے اٹھا کر اس طرف اچھالے اور کہا'یہ تمہارے لئے'۔

تعجب سے مجھے دیکھنے لگا اور بولا ' کیوں '؟

'میں انہیں نہیں بیچ سکتا۔ شرم آتی ہے۔۔۔ '۔

'اس طرح کا چھوٹا موٹا سامان بھی باقی کے ساتھ۔۔۔ '۔

میں نے اس کی بات مکمل نہیں ہونے دی اور کہا ' چھوٹا موٹا نہیں اس پر تصویریں بہت خراب ہیں '۔

مجھے ایسے دیکھنے لگا جیسے میں پاگل ہوں۔

' کیا مطلب '؟

' بتایا نا '۔

'تم بھول تو نہیں گئے ہو کہ میں اور تم کون ہیں '۔

'نہیں بھولا نہیں ہوں '۔

' یہ سب کیا ناٹک ہے '؟

اب مجھے تھوڑا تھوڑا غصہ آرہا تھا، تم کہنا کیا چاہتے ہو؟ میں اسمگلر ہوں۔ ٹھیک! لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں کچھ بھی کرلوں'۔

'میری بھی سوچو۔ میں نے جان ہتھیلی پر رکھ کر سامان یہاں پہنچایا ہے اور تم سوچ رہے ہو کہ یہ بازار ہے لہٰذا جو بھی چاہو واپس کردو'۔

میں نے اس کے پیسے نکال کر اس کی ہتھیلی پر رکھے۔

'آئندہ ایسا نہ کرنا'۔

دور ایک جگہ ایک لمحہ کے لئے تھوڑی سی روشنی ہوئی لیکن کسی دھماکہ کی آواز نہیں آئی۔ میرا ساتھی کافی پریشان تھا اسے خوش کرنے کے لئے میں نے کہا 'پہنچادوں تمہیں'؟

بغیر خدا حافظ کہے چل دیا۔ میں نے بھی گدھے کی مہار تھامی اور واپس گاؤں آ گیا۔ کتے ابھی بھی بھونک رہے تھے۔ گھر پہنچ کر میں نے سامان اتارا اور گدھے کو اصطبل میں لے جاکر باندھ دیا اور تھوڑا چارہ بھی ڈال دیا۔ اس کے بعد بندوق مخصوص جگہ رکھی اور کمرہ میں آگیا۔

سونے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ ایک گاڑی کی آواز آئی۔ کوئی گاؤں کی طرف آرہا تھا۔ اتنی رات کون ہو سکتا تھا؟ میرے کان کھڑے ہو گئے۔ تعجب ہوا! گاڑی جیسے سیدھی میرے گھر ہی کی طرف آرہی ہو۔ صحن میں نکل آیا کہ دیکھوں مجھے غلط فہمی تو نہیں ہو رہی ہے لیکن نہیں گاڑی گھر کی دیوار کے پاس پہنچ کر رک گئی۔ آگے بڑھ کر میں نے دروازہ کے پاس ایک سوراخ سے دیکھا تو ایک فوجی گاڑی کھڑی تھی اور اس میں سے دو مسلح افراد نیچے اتر رہے تھے۔ اصطبل کی طرف دیکھ کر میں نے سوچا کیا اتنا وقت ہے کہ میں جا کر اپنی کلاشنکوف اٹھالوں لیکن اصطبل کا دروازہ تو گلی میں کھلتا تھا لہٰذا بندوق کی تو سوچنا ہی بیکار تھا۔ دوبارہ میں نے سوراخ سے دیکھا تو گھر کی طرف آرہے تھے، آرام سے۔ یقیناً اطراف کا محاصرہ کر رکھا ہو گا۔ لہٰذا بھاگنا ممکن نہیں۔ اپنے آپ سے کہا دیکھا بے موت مارے گئے۔ مجھے سوچنا چاہئے تھا کہ آج کی رات عام رات نہیں ہے۔

دق الباب ہوا۔

'سلام علیکم! خیریت سے ہیں'؟

ایک دبلا پتلا لڑکا میرے سامنے کھڑا تھا، دانت اندھیرے میں چمک رہے تھے۔ مسکرا کیوں رہا تھا؟ مجھے دبوچ لیا ہے اس لئے؟

'فرمایئے'!

'ٹھیک ہیں آپ'؟

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ کیا کہنا چاہ رہا ہے؟ اس کے بعد ذہن میں ایک عجیب سا خیال آیا؛ میں نے اسے کہیں دیکھا نہیں ہے؟ ذہن پر زور دیا لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔

'معاف کیجئے گا اتنی رات آپ کے مخل ہوئے ہیں'۔

وہ پھر مسکرا رہا تھا۔ بندوق ہاتھ میں تھی۔ میں نے دل میں سوچا گرفتار کرنا ہے تو کرلے ناٹک کیوں کر رہا ہے؟

چکرا گیا۔ یہ لوگ مجھے گرفتار کرنے نہیں آئے تھے؟

'میں آپ کی بات کا مطلب سمجھا نہیں'۔

'بات واضح ہے، ہمیں آپ کی مدد درکار ہے'۔

'میری مدد'؟

'جی'۔

'آپ سمجھ رہے ہیں آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ جانتے ہیں میں کون ہوں'؟

'ہاں آپ ہمارے بھائی ہیں'۔

شاید انہیں پتہ نہیں تھا۔ میں انہیں دھوکہ نہیں دینا چاہتا تھا لہٰذا بتا دیا کہ 'میں اسمگلر ہوں، آپ کا دشمن'۔

'لگ نہیں رہا کہ آپ ہمارے دشمن ہیں، اپنے آپ سے جھوٹ مت بولئے'۔

کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ مجھے سے کھیل رہے تھے کیا؟ گاؤں کے مغرب میں ایک مارٹر آ گرا۔ دھماکہ کی آواز سن کر کتے بھی اسی طرف بھاگے۔ ان کے بھونکنے کی آواز آہستہ آہستہ دور ہوتی چلی گئی۔۔۔ علم الہدیٰ اور ان کے دوست نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

'لگتا ہے بہت نزدیک گرا ہے'۔

وہ دونوں اندھیرے کو گھور رہے تھے اور میں ابھی کچھ بھی سمجھ نہیں پایا تھا۔

'مجھ سے کیا چاہتے ہیں'؟

'ہم جانتے ہیں کہ آپ اس علاقہ کے چپہ چپہ سے واقف ہیں، آپ کی طرح اسے کوئی نہیں جانتا اور صورتحال تو آپ کو پتہ ہی ہے۔ ہمارا مقابلہ ایسے دشمن سے ہے جو سر تا پا لیس ہے۔ فی الحال ہم چھاپہ مار انداز سے ہی اس سے لڑ سکتے ہیں۔ اس لئے مجبوراً شب خون مارنے اور بارودی سرنگیں وغیرہ بچھانے جیسے کاموں پر اکتفا کرنا پڑ رہا ہے۔ اس کے لئے ہمیں ایسے شخص کی ضرورت ہے جو

علاقہ کو خوب اچھی طرح جانتا ہو۔ ہمارے ایک ساتھی تھے پیر زادہ ان کا نام تھا وہ یہ کام اچھی طرح کر لیتے تھے لیکن افسوس کہ وہ شہید ہو چکے ہیں'۔

'اور آپ سوچ رہے ہیں کہ میں آپ کی مدد کروں گا'؟

'جی'۔

'اتنے یقین سے کیسے کہہ رہے ہیں'؟

میں نے اس کے چہرہ کی طرف غور سے دیکھا تو ابھی بھی مسکرا رہا تھا اور مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس کے بعد ایک عجیب کام کیا اس نے؛ اپنی کلاشنکوف کندھے سے اتاری اور میری طرف بڑھا دی۔

'یہ بھی آپ کی رہی کل ہیڈ کوارٹر آجایئے گا'۔

'میں نے تو نہیں کہا کہ میں آؤں گا'۔

'مجھے یقین ہے آپ آئیں گے'۔

اس کے بعد اپنے ساتھی سے مخاطب ہو کر کہا 'بہتر ہے اب چلتے ہیں'۔

کلاشنکوف پر میں نے ہاتھ رکھا تو اچانک میرے منہ سے نکل گیا' میرے پاس اپنی بندوق ہے'۔

اور وہ پھر مسکرادیا' مجھے پتہ ہے لیکن یہ میری طرف سے تحفہ کے طور پر رکھ لیجئے'۔ اور پھر دونوں ہاتھوں پر رکھ کر میری طرف بڑھا دی۔ میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی لے لی، اس نے چہرہ گھمالیا۔

میں نے کہا' جب آپ نے چہرہ گھمایا تو آپ کو کیسے پتہ تھا کہ میں آپ پر فائر نہیں کروں گا'۔

جواب میں قہقہہ سنائی دیا' کل سہ پہر تک ابن سینا کالج آجایئے گا، بھولئے گا نہیں'۔

وہ لوگ گاڑی پر بیٹھ کر چل دیے اور میں اپنی جگہ بت بنارہ گیا۔ اگر مجھے آہستہ آہستہ جاتی گاڑی اور اس کی ناہموار راستوں پر بل کھاتی روشنی نظر نہ آتی تو مجھے ان کے آنے اور جانے کا یقین نہ آتا۔

کمرہ میں واپس آیا لیکن اب کوشش کے باوجود سو نہیں پایا۔

خدایا یہ کیسی رات ہے؟

کلاشنکوف ابھی میں نیچے نہیں رکھ پایا تھا۔ مجھے اپنی بندوق کیوں دے دی؟ اگر یہ نہ کیا ہوتا تو میرے لئے نہ جانا مشکل نہ ہوتا۔ کہاں میں اور کہاں انقلاب محافظ فوج کا کمانڈر!

دل بے چین ہو گیا۔ بہت سوچا۔۔۔ آخر دل پسیج گیا۔ خدا کو مخاطب کر کے کہا 'خدایا! مجھ سے کیسا امتحان لے رہا ہے؟ یہ کس جوان کو میرے راستہ میں لے آیا ہے؟ تو خود جانتا ہے میری زندگی غلط کاموں میں گذری ہے، تو جانتا ہے کہ میرا اور اس کا راستہ الگ ہے اس کے باوجود مجھے اپنے حال پر کیوں نہیں چھوڑا؟ کیا میرا انجام کچھ اور ہونا ہے'؟

ایک مرتبہ پوری زندگی سامنے آگئی۔ امی کی یاد آگئی؛ جب میں چھوٹا تو وہ ہمیشہ حر ابن یزید ریاحی کا واقعہ سنایا کرتی تھیں۔ پہلے امام حسینؑ کا راستہ روکا اس کے بعد دوراہے پر آکر کھڑا ہو گیا یا پھنس گیا، ایک راستہ باسعادت موت کی طرف جاتا تھا اور دوسرا راستہ ذلت کی زندگی کی طرف۔ حر کو انتخاب کرنا تھا اور

انتخاب کے لئے اس کے پاس زیادہ وقت بھی نہیں تھا۔ حر شش و پنج میں کیوں تھے میری سمجھ سے باہر تھا۔ جب امی سناتے سناتے اس حساس مرحلہ پر پہنچتیں اور بتاتیں کہ حر کا دل کبھی ادھر جانے کے لئے کہتا تھا اور کبھی اُدھر جانے کے لئے تو گویا میرا پورا وجود چلاتا تھا:

'حر سوچ کیا رہے ہو؟ دو دن کی زندگی کی کیا قیمت ہے؟ یہ مت بھولو کہ تمہیں حسینؑ پکار رہے ہیں۔ بہت کم کسی کو ایسی سعادت نصیب ہوتی ہے۔ موقع ہاتھ سے مت جانے دو نہیں تو زندگی بھر ہاتھ ملتے رہو گے۔ جلدی کرو حر! جلدی کرو حر! امام کی نصرت میں جو لطف ہے وہ دنیا کی کسی شے میں نہیں ہے اس کے علاوہ سب گمراہی ہے'۔

اُس وقت مجھے عاقبت بخیر ہونے کا مطلب ٹھیک سے سمجھ میں نہیں آتا تھا لیکن حر کا واقعہ سن کر مجھے ایک خاص لطف محسوس ہوتا تھا اور باطن میں ایک مٹھاس سی پیدا ہو جاتی تھی، بدن ہلکا ہلکا محسوس ہونے لگتا تھا، ہلکا اور پاک صاف۔ اس لئے کہ حر نے آخر کار انتخاب کر لیا تھا۔ پھر میں سوچتا تھا کہ

صرف اس طرح کی جنگ میں ہی اور صرف ایک بار کسی کو ایسا موقع مل سکتا ہے اور پھر اس کے انتخاب کی داستان ہر زبان پر ہو گی۔ امی بتاتی تھیں 'امام حسینؑ نے چاروں طرف دیکھا؛ آپ کے اصحاب یا قتل ہو چکے تھے یا زخمی تھے۔ فرمایا 'کیا کوئی میری مدد کرے گا؟ کیا کوئی جنت چاہتا ہے'؟

امامؑ کے کلام کا حر کے دل پر سخت اثر ہوا اپنے بھائی سے کہا 'حسینؑ مدد کے لئے پکار رہے ہیں چلو گے ان کی مدد کرنے'؟ بھائی نہ مانا۔ حر بیٹے کے پاس گئے 'چلو گے حسینؑ کی ہم رکابی لڑنے کے لئے تاکہ شہادت مل جائے'؟ بیٹے نے کہا 'بالکل چلوں گا'۔

باپ بیٹا امامؑ کی طرف چلے، حر سر جھکائے ہوئے تھے۔ جب امامؑ کے پاس پہنچے تو حر نے اپنے کو آپؑ کے قدموں پر گرا دیا اور بے تحاشہ رونے لگے۔

مجھے نہیں پتہ تھا کہ عام آدمی کے لئے اس طرح کے سخت انتخاب کا مرحلہ آ سکتا ہے۔ میری دنیا بدل گئی تھی اور وہ بھی ایک بیس، اکیس سال کے جوان

کے ذریعہ۔ پوری رات جاگتا رہا اور دوسرے دن تحفہ میں لی بندوق اٹھائی اور ابن سینا کالج چل دیا۔

حسین علم الہدیٰ مسکراتے ہوئے میرے استقبال کے لئے آگے بڑھے۔ میں نے کہا 'میرے لئے برا جال بچھایا آپ نے! سپر انداختہ ہوں! آپ کا قیدی ہوں'۔

'آپ کسی کے قیدی نہیں ہیں۔ میں نے اگر آپ کو آنکھوں میں حریت نہ دیکھی ہوتی تو کبھی آپ کی تلاش میں نہ نکلتا'۔

'آپ نے پہلے مجھے دیکھا تھا'؟

'ہویزہ میں ایک دن گاڑی سیدھی ہمارے سامنے موڑی تھی، یاد ہے'؟

اب مجھے پتہ چلا کہ کیوں مجھے لگ رہا تھا کہ انہیں کہیں دیکھا ہے۔